يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ

دورِ حاضر کے مالی معاملات

کا

شرعی حکم

حافظ ذوالفقار علی

دورِ حاضر کے مالی مُعاملات کا شرعی حُکم

حافظ ذوالفقار علی حفظہ اللہ

ناشر
ابوہریرہ اکیڈمی
37۔ کریم بلاک اقبال ٹاؤن لاہور۔ 042-5417233

نام کتاب:------------------- دورِ حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم

مؤلف:---------------------- حافظ ذوالفقار علی

ایڈیشن:--------------------- اوّل - ستمبر 2008ء

تعداد:---------------------- 1100/-

قیمت:----------------------

کمپوزنگ:------------------- ناظم شہزاد
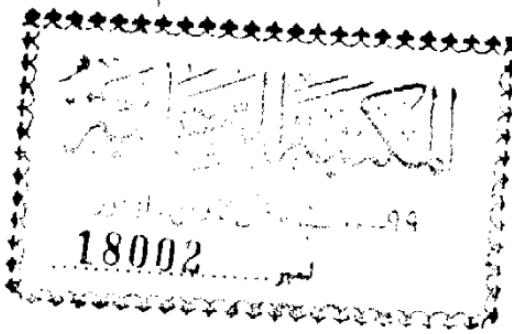
ناشر

ابوہریرہ اکیڈمی

37- کریم بلاک اقبال ٹاؤن لاہور

فون:042-5417233

فہرست مضامین

مروجہ معاملات کی تفصیل

اسلامی بینکاری کی حقیقت!

تکافل: مروجہ اسلامی انشورنس

قرض کے مسائل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا یہ پختہ اعتقاد ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، سیاسی ہو یا اخلاقی، معاشرتی ہو یا معاشی جس کے متعلق دین میں اصولی رہنمائی موجود نہ ہو۔ مثلاً معیشت وتجارت کو لے لیجیے قرآن وحدیث میں اس حوالے سے واضح، غیر مبہم اور قطعی اصول بیان ہوئے ہیں جن کی روشنی میں ہم ہر دور میں پیش آنے والے مسائل کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔ ہمارے محدثین کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے عبادات ہی کی طرح معاملات سے متعلق احادیث نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بھی ہم تک پہنچائی ہیں۔

کتب حدیث میں معاملات کے ابواب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ جب تک معاملات درست نہ ہوں انسان کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی زندگی اسلامی زندگی بن سکتی ہے۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے حرام کے علاوہ مشتبہ امور کے ارتکاب کو بھی انسان کے دین اور آبرو کے لیے خطرے کی علامت قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

((فَمَنِ اتَّقَى الْمُشَبَّهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهِ وَعِرْضِهِ ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ كَرَاعٍ يَرْعَى حَوْلَ الْحِمَى ، يُوْشِكُ أَنْ يُوَاقِعَهُ)) [صحيح بخاری: كتاب الايمان، باب فضل من استبرء لدينه]

”جو شخص شبہات سے بچا اس نے اپنا دین اور عزت بچالی۔ اور جو شبہات میں پڑ گیا اس کی مثال اس چرواہے کی ہے جو (شاہی) چراگاہ کے آس پاس (اپنے جانور) چراتا ہے، قریب ہے اس میں جا گھسے۔“

مگر بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ آج مسلمانوں کی اکثریت دین سے بیگانگی کے باعث

اسلام کے ان سنہری اصول سے نابلد ہے۔ جو لوگ نماز، روزہ کے پابند ہیں ان میں بھی ایک طبقہ ایسا ہے جس نے دین صرف عبادات، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کا نام سمجھ لیا ہے۔ مالی معاملات کے بارہ میں احکامِ شرعیہ کو اس طرح نظر انداز کیے ہوئے ہیں کہ گویا ان کا دین کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ بالخصوص جدید معاملات کے متعلق ان کا اندازِ فکر یہ ہے کہ یہ چونکہ دورِ حاضر کی پیداوار ہیں عہد رسالت میں ان کا وجود ہی نہیں تھا اس لیے یہ جائز ہیں۔ ان حالات میں اہلِ علم پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ معاملاتِ جدیدہ کو سمجھیں اور لوگوں کی صحیح اور کماحقہ رہنمائی کریں۔

علماء کرام تبریک و تحسین اور قدر افزائی کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس حوالے سے قابل قدر کام کیا ہے۔ خصوصاً علمائے عرب نے اس سلسلے میں بہت عمدہ کوششیں کی ہیں۔ جدید مالی معاملات میں سے شاذ و نادر ہی کوئی ایسا مسئلہ ہوگا جس پر عربی زبان میں مستقل کتاب نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سب کی مساعی حسنہ کو قبول فرمائے اور اس خدمت کو ذریعہ نجات بنائے۔

احقر نے بھی اس ضمن میں ادنیٰ سی کاوش کی ہے جو

دورِ حاضر کے مالی معاملات کا شرعی حکم

کے عنوان سے حاضر خدمت ہے

یاد رہے! یہ کتاب اصل میں راقم کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ہفت روزہ ''الاعتصام'' اور بعض دیگر جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں اب حک و اضافہ کے بعد ان کو کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حرام اور مشتبہ امور سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حافظ ذوالفقار علی

ابو ہریرہؓ شریعہ کالج

کریم بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ارشادِ باری تعالیٰ

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبَا إِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ ○ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُءُوْسُ أَمْوَالِکُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ○﴾

[البقرۃ:۲۷۹۔۲۷۸]

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈر جاؤ اور چھوڑ دو باقی سود، اگر تم مومن ہو۔ پھر اگر تم نے یہ نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ اور اگر تم نے توبہ کر لی تو تمہارے لیے تمہارے اصل مال ہیں نہ تم ظلم کرو اور نہ تم ظلم کیے جاؤ۔''

* .... * .... *

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَأْکُلُوْا أَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَکُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْکُمْ وَلَا تَقْتُلُوْا أَنْفُسَکُمْ إِنَّ اللّٰهَ کَانَ بِکُمْ رَحِیْمًا ○﴾[النساء:۲۹]

''اے ایمان والو! تم اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے اور نہ تم قتل کرو اپنے نفسوں کو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

فرمودات نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

((يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يُبَالِي الْمَرْءُ مَا أَخَذَ مِنْهُ أَمِنَ الْحَلَالِ أَمْ مِنَ الْحَرَامِ)) [صحيح بخاری: كتاب البيوع، باب من لم يبال من حيث كسب المال]

''لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا جب انسان کو اس کی پروا نہیں رہے گی کہ اس نے جو حاصل کیا ہے وہ حلال ہے یا حرام۔''

........................*

((دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يَرِيبُكَ)) [سنن الترمذی: باب ما جاء فی شان الحساب والقصاص]

''جو چیز تجھے شک میں ڈالے اس کو چھوڑ دے جو شک میں نہ ڈالے اس کو قبول کر لے۔''

........................*

((لَا يَحِلُّ سَلَفٌ وَبَيْعٌ وَلَا شَرْطَانِ فِي بَيْعٍ وَلَا رِبْحُ مَا لَمْ يُضْمَنْ وَلَا بَيْعُ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ)) [سنن الترمذی، باب ما جاء فی كراهية بيع ماليس عنده]

''قرض اور بیع، ایک بیع میں دو شرطیں اور اس چیز کا نفع جس کا رسک برداشت نہ کیا گیا ہو جائز نہیں اور اس چیز کی بیع بھی درست نہیں جو تیرے پاس موجود نہیں۔''
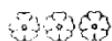
باب اول

اسلام اور جدید مسائل

خصوصیاتِ اسلام:

اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو جن امتیازی خوبیوں سے نوازا ہے ان میں تین خوبیاں بڑی نمایاں ہیں:

۱۔ عالم گیریت۔

۲۔ ابدیت (قیامت تک کے لیے)۔

۳۔ جامعیت اور ہمہ گیریت۔

(۱) عالم گیریت:

یعنی اسلام کے مخاطب کسی ایک نسل یا خطے کے لوگ نہیں بلکہ یہ ہر دور اور ہر جگہ کے لیے ہے۔

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمٰتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝﴾[الاعراف:۱۵۸]

''آپ فرما دیں: لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے، لہٰذا اللہ اور اس کے رسول نبی اُمّی پر ایمان لاؤ جو اللہ اور اس کے ارشادات پر ایمان لاتا ہے اور اسی کی پیروی کرو امید ہے تم راہِ راست پا لو گے۔''

﴿وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِينَ ۝﴾[الانبیاء:۱۰۷]

''اور ہم نے آپ ﷺ کو تمام دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

﴿تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا ۝﴾

[الفرقان:۱]

''بہت بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان (قرآن) نازل کیا تاکہ وہ تمام جہانوں کے لیے (برے انجام سے) ڈرانے والا بن جائے۔''

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝﴾[السباء:۲۸]

''اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے ولا بنا کر بھیجا مگر اکثر لوگ نہیں جانتے''

﴿إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ۝﴾[التکویر:۲۷]

''یہ تو سارے جہاں والوں کے لیے نصیحت ہے۔''

نبی ﷺ کی حدیث ہے:

((أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا فَأَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي أَدْرَكَتْهُ الصَّلَاةُ فَلْيُصَلِّ وَأُحِلَّتْ لِيَ الْمَغَانِمُ وَلَمْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ قَبْلِي وَأُعْطِيتُ الشَّفَاعَةَ وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً)) [صحيح بخاری : كتاب التيمم، باب قول الله تعالىٰ فلم تجدوا ماء فتيمموا صعيدا طيبا]

''مجھے پانچ چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں۔

۱۔ ایک مہینے کی مسافت کے ساتھ میری مدد کی گئی ہے۔

۲۔ میرے لیے زمین مسجد اور پاک کرنے والی بنا دی گئی ہے، میری امت میں سے جس آدمی کو جہاں نماز کا وقت پالے وہ نماز پڑھ لے۔

۳۔ میرے لیے غنیمتیں حلال کی گئیں ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں تھیں۔

۴۔ مجھے شفاعت عطا کی گئی ہے۔

۵۔ پہلے انبیاء علیہم السلام خاص قوم کی طرف آتے تھے اور مجھے تمام لوگوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہے۔''

(۲) ابدیت:

یعنی اسلامی تعلیمات ایک خاص دور یا مخصوص مدت کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے ہیں کیونکہ یہ آخری دین اور نبی ﷺ آخری نبی ہیں۔

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۝﴾[الاحزاب: ٤٠]

''محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

ختم نبوت کا تقاضا یہی ہے کہ اس دین کی تعلیمات ایک مخصوص مدت کے لیے نہ ہوں بلکہ قیامت تک کے لیے ہوں۔

نبی ﷺ کا فرمان ہے:

((نَحْنُ الْآخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) [صحيح بخاري : كتاب الجمعة، باب فرض الجمعة]

''ہم آخری ہیں لیکن قیامت کے دن سب سے آگے ہوں گے۔''

(۳) جامعیت اور ہمہ گیریت:

اس کا مطلب ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق اسلام نے ہماری رہنمائی نہ کی ہو، اس میں ضروریاتِ زندگی کے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَى لِلْمُسْلِمِينَ ۝﴾[النحل: ٨٩]

''اور ہم نے آپ ﷺ پر ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں ہر چیز کی وضاحت موجود ہے اور اس میں مسلمانوں کے لیے ہدایت، رحمت اور خوش خبری ہے۔''

﴿وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝﴾[الاعراف:۵۲]

''ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں جسے ہم نے علم کی بنا پر مفصل بنا دیا ہے، یہ کتاب ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں۔''

﴿وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا ۝﴾[بنی اسرائیل:۱۲]

''اور ہم نے ہر چیز کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔''

﴿لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝﴾[یوسف:۱۱۱]

''ان قصوں میں اہل عقل وخرد کے لیے (کافی سامان) عبرت ہے، یہ قرآن کوئی ایسی بات نہیں جو گھڑ لی گئی بلکہ یہ تو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے، اس میں ہر بات کی تفصیل موجود ہے اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔''

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ﴾ میں جس اکمال کا اعلان فرمایا گیا ہے اس کا معنی بھی یہی ہے کہ اس میں انسانی ضرورت اور حلت وحرمت کی تمام باتیں بیان کر دی گئی ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فليست تنزل في أحد من أهل دين الله نازلة إلا وفي كتاب الله الدليل))[الرسالة: ج۱، ص۲۰]

''کتاب اللہ میں مسلمانوں کو ہر پیش آمدہ مسئلے کے متعلق راہ نمائی موجود ہے۔''

شیخ المحدثین امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((لا اعلم شيئا يحتاج اليه الا وهو في الكتاب والسنة))

''کتاب وسنت میں تمام ضروری مسائل کا حل موجود ہے۔''

پوچھا گیا:

((هل يمكن معرفة ذلك ؟قال نعم))[مقدمة فتح الباری:ص ٤٨٩]

''کیا اس کی معرفت ممکن ہے؟ کہا ہاں۔''

ثابت ہوا کہ اسلام میں بدلتے ہوئے معروضی حالات اور عصری تقاضے پورے کرنے کی مکمل صلاحیت موجود ہے۔

اسلام اور معیشت وتجارت:

صنعت وتجارت انسانی زندگی کے لازمی اجزاء ہیں، ان کے متعلق اسلام کیوں کر خاموش رہ سکتا تھا۔ قرآن وحدیث میں معاملات کے بارے میں بالکل واضح اور غیر مبہم ہدایات دی گئی ہیں، جو صورتیں معاشرے کے لیے مفید تھیں انہیں باقی رکھا گیا ہے اور جو مضر تھیں وہ سب حرام قرار دی گئیں ہیں:

﴿وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ۞﴾[البقرة:٢٧٥]

''اور اللہ نے بیع کو حلال کیا اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔''

﴿وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۞﴾[البقرة:١٨٨]

''اور آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ' نہ مقدمات اس غرض سے حکام تک لے جاؤ کہ دوسرے کے مال کا کچھ حصہ ناحق طور پر ہضم کر جاؤ، حالانکہ حقیقت حال تمہیں معلوم ہوتی ہے۔''

مشہور محدث ومفسر ابن العربی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یہ آیت معاملات کے قواعد میں سے اور معاوضات کی اساس ہے۔''[احکام القرآن: جلد ١، ص ١٨٥]

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۞﴾[النساء:٢٩]

''اے ایمان والو! تم اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضا مندی سے اور نہ تم قتل کرو اپنے نفسوں کو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

اس ممانعت میں ناجائز طریقے سے مال حاصل کرنے کے تمام ذرائع شامل ہیں چونکہ اسلامی ہدایات سراسر معاشرے کے مفاد میں ہیں۔جن کو نظر انداز کرنے سے معاشی بگاڑ پیدا ہونا یقینی امر ہے، اس لیے مسلم معاشرے میں ان لوگوں کو کاروبار کی قطعی اجازت نہیں جو تجارت کے متعلق اسلامی احکام سے ناواقف ہوں، چنانچہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے۔

((لَا يَبِعْ فِي سُوقِنَا إِلَّا مَنْ تَفَقَّهَ فِي الدِّيْنِ)) [جامع ترمذی :ابواب الوتر،باب ماجاء فی فضل الصلاۃ علی النبی]

''ہمارے بازاروں میں وہی خرید وفروخت کرے جسے دین کی سمجھ ہو۔''

یعنی خرید وفروخت کے متعلق دینی احکام سے آگاہ ہو۔امام ترمذی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اثر کو حسن قرار دیا ہے۔

بعض شبہات کا ازالہ:

پہلا شبہ: بعض جدت پسندوں کے خیال میں اسلامی ہدایات بلاشبہ تمام نسلوں اور زمانوں کے لیے ہیں مگر ان کا دائرہ عمل صرف عقائد وعبادات تک محدود ہے۔سیاسی، معاشی اور معاشرتی معاملات میں ہم آزاد ہیں کہ اپنے حالات کے مطابق جس طرح چاہیں فیصلہ کریں ،اس نقطۂ نظر کی تائید میں ایک روایت بھی توڑ مروڑ کر پیش کی جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ))[صحیح مسلم :کتاب الفضائل ،باب وجوب امتثال ماقاله شرعا......]

''تم اپنے دنیوی معاملات کو بہتر جانتے ہو''

جواب:

ہمارے نزدیک اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ان مہربانوں نے دیگر مذاہب کی طرح دین اسلام کو بھی محض چند مخصوص عقائد اور خود ساختہ رسومات کا مجموعہ سمجھ لیا ہے حالانکہ اسلام تو ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو دینی معاملات کے ساتھ ساتھ سیاسی، معاشرتی اور معاشی مسائل جیسے تمام معاملات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ دین و دنیا کی جو تفریق عیسائیت میں ہے کہ شخصی زندگی کے ایک محدود گوشے کے سوا باقی ساری اجتماعی اور سیاسی زندگی مذہب کے دائرہ بحث سے خارج ہے اسلام میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ دین کا ہر طالب علم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ قرآن مجید میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے بارہ میں بھرپور راہنمائی موجود ہے۔

جن حضرات کو صحیح بخاری کے مطالعہ کا موقع ملا ہے وہ ہمارے مؤقف کی تائید فرمائیں گے کہ کس طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں عقائد و عبادات، معاشی و معاشرتی مسائل، سیاسی امور، بین الاقوامی تعلقات، حدود و تعزیرات اور دیگر گوشہ ہائے زندگی کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث جمع فرمادی ہیں، باقی رہ گئے آپ کے زیر بحث الفاظ تو ان کا ایک خاص محل ہے وہ یہ کہ ہماری زندگی کا وہ دائرہ جسے ہم دنیا سے تعبیر کرتے ہیں اس کے متعلق اسلام نے صرف بنیادی باتیں ذکر کی ہیں اس کے بعد ہمیں آزاد چھوڑ دیا ہے تفصیلات و جزئیات بیان نہیں کیں، البتہ وہ دائرہ جسے دین کہا جاتا ہے اس میں ہم پابند ہیں، اپنی مرضی سے ایک قدم ادھر ادھر نہیں اٹھا سکتے۔

کاروبار کی جو صورت شریعت کی ہدایات یا مقاصد کے خلاف نہ ہو وہ جائز ہے:

اس بات کو علماء رحمہم اللہ یوں بیان کرتے ہیں:

”عبادات میں اصل حرمت ہے جب تک شارع کی طرف سے نص نہ ہو کوئی کام کرنا جائز نہیں ہوتا اور معاملات میں اصل اباحت ہے یعنی لین دین کی ہر وہ صورت جائز ہے جس سے شریعت نے منع نہ کیا ہو۔“

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((والأصل فی ھذا انہ لایحرم علی الناس من المعاملات التی یحتاجون الیھا إلا مادل الکتاب والسنة علی تحریمہ کما لایشرع لھم من العبادات التی یتقربون بھا إلی اللہ الا مادل الکتاب و السنة علی شرعہ))[مجموع الفتاویٰ لابن تیمیة: ج۲۸ ص۳۸۶]

''اس بارہ میں اصل یہ ہے کہ وہ معاملات جن کی لوگوں کو ضرورت ہوتی ہے ان میں سے صرف وہی حرام ہیں جن کی حرمت پر کتاب وسنت دلالت کر رہی ہوں جیسا کہ عبادات میں سے وہی جائز ہیں جن کی مشروعیت پر قرآن وحدیث میں رہنمائی موجود ہو۔''

زیر بحث حدیث کے علاوہ ذیل کی احادیث سے بھی اس اصول کی تائید ہوتی ہے:

((اَلْمُسْلِمُوْنَ عِنْدَ شُرُوْطِهِمْ))[بخاری: کتاب الاجارہ،باب اجر السمسرة]

''مسلمان اپنی شرطوں کے مطابق ہیں۔''

دوسرے مقام پر آپ ﷺ ارشاد ہے:

((اَلْمُسْلِمُوْنَ عَلٰی شُرُوْطِهِمْ إِلَّا شَرْطًا حَرَّمَ حَلَالًا أَوْ أَحَلَّ حَرَامًا))

[جامع ترمذی: کتاب الاحکام ،باب ماذکر عن رسول اللہ فی الصلح بین الناس]

''مسلمان اپنی شرطوں پر ہیں مگر وہ شرط جو حرام کو حلال یا حلال کو حرام قرار دے''

عبادات کے متعلق آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ))[صحیح بخاری : کتاب الاذان ، باب الاذان للمسافر اذا کانو جماعة......]

''نماز پڑھو! جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو۔''

متذکرہ بالا احادیث کے علاوہ ذیل کی آیات بھی اس کی تائید کرتی ہیں:

﴿قُلْ أَرَأَيْتُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ لَكُم مِّن رِّزْقٍ فَجَعَلْتُم مِّنْهُ حَرَامًا وَحَلَالًا قُلْ آللَّهُ أَذِنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى اللَّهِ تَفْتَرُونَ ﴾[یونس:۵۹]

''آپ ﷺ ان سے کہیں کیا تم نے سوچا کہ اللہ نے تمہارے لیے جو رزق اتارا تھا اس میں سے تم نے خود ہی کسی کو کو حرام قرار دے لیا اور کسی کو حلال، تو کیا اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی ہے یا تم اللہ پر جھوٹ باندھتے ہو؟''

﴿اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ وَلِتَبْتَغُوا مِن فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴾[الجاثیة:۱۲،۱۳]

''اللہ ہی ہے جس نے سمندر کو تمہارے تابع کر دیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو اور جو کچھ آسمانوں میں یا زمین میں ہے سب کچھ تمہارے لیے کام پر لگا رکھا ہے غور وفکر کرنے والوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔''

سورۃ یونس کی متذکرہ بالا آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی ہیں جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کی عادات اور عرف کی بنیاد پر بعض چیزوں کو حرام قرار دے رکھا تھا۔

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ﴾[النحل:۱۱۶]

''جو جھوٹ تمہاری زبانوں پر آجائے اس کی بنا پر یوں نہ کہا کرو کہ یہ چیزیں حلال ہیں اور یہ حرام ہیں تاکہ تم اللہ پر جھوٹ باندھنے لگو اور جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ کبھی فلاح نہیں پاتے۔''

اس آیت میں خواہشات نفس سے مباح اشیاء کو حرام قرار دینے کی ممانعت ہے:

﴿وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ۝﴾

[الانعام:۱۱۹]

''جو کچھ اس نے تم پر حرام کیا ہے اسے تمہارے لیے تفصیلاً بیان کر دیا گیا ہے الا یہ کہ تم (کوئی حرام چیز کھانے پر) مجبور ہو جاؤ۔''

امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَكُلُّ مَا لَمْ يُفَصَّلْ لَنَا تَحْرِيْمُهُ فَهُوَ حَلَالٌ بِنَصِّ الْقُرْآنِ، إِذْ لَيْسَ فِي الدِّيْنِ إِلَّا فَرْضٌ أَوْ حَرَامٌ أَوْ حَلَالٌ، فَالْفَرْضُ مَأْمُوْرٌ بِهِ فِي الْقُرْآنِ وَالسُّنَّةِ، وَالْحَرَامُ مُفَصَّلٌ بِاسْمِهِ فِي الْقُرْآنِ وَالسُّنَّةِ، وَمَا عَدَا هٰذَيْنِ فَلَيْسَ فَرْضًا وَلَا حَرَامًا فَهُوَ بِالضَّرُوْرَةِ حَلَالٌ)) [المحلیٰ بآثار لابن حزم: ج ۱٤ ص ۳۵۷]

''ہر وہ چیز جس کی حرمت بیان نہیں ہوئی وہ اس قرآنی نص کے مطابق حلال ہے، کیونکہ دین میں یا تو فرض ہیں یا حلال یا حرام، جو فرض ہیں قرآن وسنت میں نام لے کران کا حکم دیا گیا ہے جو حرام ہیں ان کی تفصیل بھی موجود ہے ان دونوں کے علاوہ جو نہ فرض ہیں نہ حرام وہ بداہتاً حلال ہیں۔''

دوسرا شبہ:

بعض حضرات یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ:

''بہت سے ایسے معاملات ہیں جو دورِ حاضر میں معاشرتی زندگی کا لازمی حصہ بن چکے ہیں لیکن عہدِ رسالت میں ان کا ذکر تک نہیں ملتا اور نہ کتب حدیث وفقہ میں ان کا کوئی تذکرہ ہے پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں ضرورت زندگی کے ہر مسئلہ کا حل موجود ہے۔؟''

ہماری رائے میں یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ معاملات میں اصل اباحت ہے یہ سوال بالکل بے معنی ہے کیونکہ اس اصول کے مطابق لین دین کی ہر وہ صورت جائز ہوگی جس سے

شریعت نے منع نہ کیا ہو۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھیے اس کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ جس چیز کا نام لے کر اسلام نے منع نہ کیا ہو وہ جائز ہے بلکہ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ لین دین کی ہر وہ شکل جو اسلام کے بیان کردہ اصول اور مقاصد شریعت کے خلاف نہ ہو وہ جائز ہے۔

ہمارے خیال میں کوئی ایسا نیا مسئلہ موجود نہیں جو انسانی زندگی کے لیے ضروری ہو لیکن قرآن وحدیث کی اصولی ہدایات، مقاصد شریعت اور فقہی قواعد کی روشنی میں اس کا حل ممکن نہ ہو! عہد رسالت کے بعد پیدا ہونے والے مسائل کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین عظام، محدثین فقہاء اور علمائے اسلام رحمہم اللہ کے فتاویٰ اس کا واضح ثبوت ہیں۔

خلاصہ

❀ قرآن وحدیث کی اصولی ہدایات اور مقاصد شریعت کی روشنی میں ہر مسئلہ کا حل ممکن ہے۔

مالی معاملات کے بنیادی اصول

شریعت نے جن مالی معاملات کو ممنوع قرار دیا ہے اگر گہری نظر سے ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ چیزیں جو شرعاً قابل انتفاع ہوں انسان کی ملکیت اور قبضہ میں ہوں دو اصولوں کی پابندی کے ساتھ ان کا دوسرے کے ساتھ معاملہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ معاملہ ربا (سود) سے پاک ہو۔

۲۔ غَرَرُ (Uncertainty) سے مبرا ہو۔

بشرطیکہ اس میں ممانعت کی کوئی خارجی وجہ یا ایک عقد میں دو عقد یا ایسی شرط جو مقتضی عقد کے خلاف ہو یا ایک عقد میں دو شرطیں نہ پائی جارہی ہوں۔

علاوہ ازیں خرید وفروخت اور قرض کا معاملہ بھی جمع نہیں ہوسکتے یعنی قرض دینے کی شرط پر چیز خریدنا یا قرض دینے کے بدلے خریدنے کی شرط لگانا جائز نہیں۔

شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی تجارت حرام ہے کیونکہ یہ چیزیں شرعاً قابل انتفاع نہیں۔ بیع پر بیع منع ہے کہ ان میں ممانعت کی خارجی وجہ پائی جاتی ہے۔ فی نفسہٖ بیع میں کوئی خرابی نہیں۔

چنانچہ علامہ ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ ممنوعہ بیوع کا تذکرہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

((ولا تخرج عن ثلاثة اقسام؛وهي الربا والباطل والغرر ويرجع الغرر بالتحقيق الى الباطل فيكون قسمين على الآيتين)) [احكام القرآن: ج ١ ص ٢٦٤]

''یہ سب تین قسموں میں شامل ہے اور وہ تین قسمیں یہ ہیں: (۱) سود۔ (۲) باطل طریقے سے مال کمانا۔ (۳) غرر۔ حقیقت میں غرر بھی باطل طریقے سے مال کمانے

میں شامل ہے یوں دو آیتوں کے مطابق دو قسمیں ہی بنتی ہیں۔"

فقہائے اہل سنت نے بیع کے جو ضوابط بیان فرمائے ہیں ان کی بنیاد یہی اصول ہیں۔ذیل میں اختصار کے ساتھ سود اور غرر کے متعلق ضروری باتیں بیان کی جاتی ہیں۔

ربا(سود):

سرمایہ دارانہ نظام میں تجارت اور ربا کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔سرمایہ دار کے نزدیک اقتصادی سرگرمیوں کے لیے ربا ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اسلام جس طرح کا عادلانہ اور منصفانہ معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے وہ ربا کی موجودگی میں ممکن نہیں، خواہ وہ ذاتی قرضوں پر لیا جائے یا تجارتی قرضوں پر۔کیونکہ ربا سے جو ذہنیت پرورش پاتی ہے وہ قدم بہ قدم اسلام سے ٹکراتی ہے۔یہ معاشرے کے مختلف طبقات میں عداوت کا باعث بنتا ہے۔غریبوں پر صریح ظلم اور لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھانے کی قبیح ترین شکل ہے۔اس لیے اسلام نے اس کو حرام قرار دیا ہے اور اسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے مرتکب کے ساتھ اعلان جنگ فرمایا ہے،لہٰذا لین دین کی ہر وہ صورت ناجائز ہے جس میں ربا کا عنصر پایا جائے۔

ذیل میں ربا کے متعلق قرآن کی بعض آیات اور نبی ﷺ کی احادیث ملاحظہ ہوں۔

﴿اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ إِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِیْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِکَ بِأَنَّهُمْ قَالُوْا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰی فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهٗ إِلَی اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولٰٓئِکَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ ○ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِی الصَّدَقَاتِ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيْمٍ ○﴾ [البقرة:٢٧٥،٢٧٦]

"جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ یوں کھڑے ہوں گے جیسے شیطان نے کسی شخص کو چھو کر مخبوط الحواس بنا دیا ہو۔اس کی وجہ ان کا یہ قول ہے کہ تجارت بھی تو آخر سود کی طرح

ہے، حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام، اب جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچ گئی اور وہ سود سے رک جائے تو پہلے جو سود کھا چکا اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے مگر جو پھر بھی سود کھائے تو یہی لوگ دوزخی ہیں، جس میں ہمیشہ رہیں گے اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کی پرورش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے بندے کو پسند نہیں کرتا۔"

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ [آل عمران: ۱۳۰]

"اے ایمان والو! سود کو دگنا چوگنا کر کے مت کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم آخرت میں نجات پا سکو۔"

((اجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوبِقَاتِ قَالُوا يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَمَا هُنَّ قَالَ الشِّرْكُ بِاللّٰهِ وَالسِّحْرُ وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَكْلُ الرِّبٰوا وَأَكْلُ مَالِ الْيَتِيمِ وَالتَّوَلِّي يَوْمَ الزَّحْفِ وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ)) [صحيح بخاری: كتاب الوصايا، باب قول الله تعالىٰ ان الذين يأكلون ......الخ]

"سات مہلک گناہوں سے بچو صحابہ نے پوچھا اللہ کے نبی وہ کون سے گناہ ہیں؟ آپ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شریک کرنا، جادو کرنا، جس نفس کو اللہ نے حرام کیا ہے اس کو ناحق قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جنگ کے دن پیٹھ دکھا کر بھاگنا، پاک دامن اور بھولی بھالی عورتوں پر تہمت لگانا"

((قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دِرْهَمٌ رِبًا يَأْكُلُهُ الرَّجُلُ وَهُوَ يَعْلَمُ أَشَدُّ مِنْ سِتَّةٍ وَثَلَاثِينَ زَنْيَةً)) [مسند احمد: ۲۰۹۵۱]

"ربا کا ایک درہم جو انسان علم ہونے کے باوجود کھاتا ہے ۳۶ (چھتیس) زناؤں سے زیادہ سخت ہے۔"

((الربا ثلاثة و سبعون بابا ، أيسرها مثل أن ينكح الرجل أمه))

[مستدرك حاكم: كتاب البيوع]

''سود کے ستر دروازے ہیں سب سے ہلکا یہ ہے کہ انسان اپنی ماں کے ساتھ نکاح کرے''

اس لیے نبی ﷺ نے اس میں ملوث تمام لوگوں کو لعنتی قرار دیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

((لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اٰكِلَ الرِّبٰوا وَمُوْكِلَهُ وَكَاتِبَهُ وَشَاهِدَيْهِ وَقَالَ هُمْ سَوَاءٌ)) [صحيح مسلم: كتاب المساقاة، باب لعن آكل الربا وموكله]

''نبی کریم ﷺ نے سود کھانے، سود کھلانے، لکھنے والے اور اس کے گواہوں پر لعنت فرمائی ہے اور فرمایا یہ سب گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔''

سود کی حرمت پر اجماع ہے:

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((كل قرض شرط فيه ان يزيده فهو حرام بغير خلاف))

[المغنى: ج٩: ص ١٠٤]

''ہر وہ قرض جس میں اضافے کی شرط ہو وہ بلا اختلاف حرام ہے''

شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وقد اتفق العلماء على ان المقرض متى اشترط زيادة على قرضه كان ذلك حرام))[مجموع الفتاوىٰ: ج ٢٩ ص ٣٣٤]

''سب علماء اس بات پر متفق ہیں کہ قرض دینے والا جب اپنے قرض پر اضافے کی شرط لگائے تو یہ حرام ہوگا۔''

علامہ ماوردی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

((اجمع المسلمون علی تحریم الربا وعلی انه من الکبائر))

[عمدة القاری: ج١١ ص ٢٠٠]

''سود کی حرمت اور اس کے کبیرہ گناہ ہونے پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔''

ربا ایک وسیع الذیل موضوع ہے۔ یہاں اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ممکن نہیں اس لیے ہم صرف اس کی تعریف اور قسمیں ذکر کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

ربا کا معنی و مفہوم:

عربی لغت میں ربا کا معنی ہے:

((الفضل ،الزیادة،النماء))

''زائد، زیادتی اور نمو''

اصطلاح میں ربا کا لفظ دو معنوں کے لیے آتا ہے:

١۔ قرض یا دین کی اصل رقم پر جو زائد رقم بطور شرط یا معاہدہ لی جائے یا ایک جنس کی دو چیزوں کا اس طرح تبادلہ کیا جائے کہ دونوں یا ایک طرف سے ادھار ہو۔ اس کو ربا النسیئة کہا جاتا ہے۔

٢۔ ایک طرح کی دو چیزوں کا کمی بیشی سے تبادلہ یہ ربا الفضل کہلاتا ہے۔

علامہ ڈاکٹر عمر بن عبد العزیز المترک رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((وهناك من العلماء من یری ان الربا اسم یقع علی کل البیوع المحرمة)) [الربا والمعاملات المصرفیة فی نظر الشریعة الاسلامیة: ص ٤٤]

''بعض علماء کے خیال میں ربا کا اطلاق تمام حرام بیوع پر ہوتا ہے''

قرآن کی روشنی میں ربا الفضل کا حکم:

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فَإِنَّهُ يَتَنَاوَلُ كُلَّ مَا نُهِيَ عَنْهُ مِنْ رِبَا النَّسَاءِ وَرِبَا الْفَضْلِ وَالْقَرْضِ الَّذِي يَجُرُّ مَنْفَعَةً وَغَيْرَ ذَلِكَ))

''ربا کا لفظ ربا النسیئۃ، ربا الفضل اور جو قرض نفع کا باعث بنے سب کو شامل ہے۔''

احادیث میں ربا الفضل کا حکم:

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا:

((يَنْهَى عَنْ بَيْعِ الذَّهَبِ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ بِالْفِضَّةِ وَالْبُرِّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِيرِ بِالشَّعِيرِ وَالتَّمْرِ بِالتَّمْرِ وَالْمِلْحِ بِالْمِلْحِ إِلَّا سَوَاءً بِسَوَاءٍ عَيْنًا بِعَيْنٍ فَمَنْ زَادَ أَوِ ازْدَادَ فَقَدْ أَرْبَى فَرَدَّ النَّاسُ مَا أَخَذُوا))

[صحيح مسلم: كتاب المساقات، باب الصرف وبيع الذهب بالورق نقدا]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم سونے کی سونے کے ساتھ، چاندی کی چاندی کے ساتھ گندم کی گندم کے ساتھ جو کی جو کے ساتھ کھجور کی کھجور کے ساتھ اور نمک کی نمک کے ساتھ بیع سے منع فرماتے تھے الا یہ کہ برابر برابر اور نقد ہوں جو زیادہ لے یا زیادہ دے وہ ربا کا مرتکب ہوا تو لوگوں نے جو لیا تھا وہ لوٹا دیا۔''

ظاہر ہے دو ایک طرح کی چیزوں کے تبادلے کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب ان کی جنس ایک ہونے کے باوجود کوالٹی میں فرق ہو اس صورت میں اسلام نے ہمارے سامنے دو ہی راستے رکھے ہیں۔

۱۔ جو کم تر چیز کے بدلے اعلیٰ یا اعلیٰ کے بدلے کم تر لینا چاہتا ہے وہ پہلے اس چیز کو بازار میں فروخت کرے اس کے بعد اپنی مطلوبہ چیز خریدے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

((أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْتَعْمَلَ رَجُلًا عَلَى خَيْبَرَ فَجَاءَهُ بِتَمْرٍ جَنِيبٍ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَكُلُّ تَمْرِ خَيْبَرَ هَكَذَا قَالَ لَا وَاللَّهِ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّا لَنَأْخُذُ الصَّاعَ مِنْ هَذَا

بِالصَّاعَيْنِ وَالصَّاعَيْنِ بِالثَّلَاثَةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَفْعَلْ بِعْ الْجَمْعَ بِالدَّرَاهِمِ ثُمَّ ابْتَعْ بِالدَّرَاهِمِ جَنِيْبًا))

[صحيح بخاری: کتاب البيوع ،باب اذا اراد بيع تمر بتمر خير منه]

''نبی ﷺ نے خیبر پر ایک آدمی کو عامل مقرر کیا وہ آپ ﷺ کے پاس بہترین کھجوریں لے کر آیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا خیبر کی تمام کھجوریں اس قسم کی ہیں؟ اس نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول ﷺ واللہ ایسی نہیں ہیں ہم دو صاع کے بدلے اس کا ایک صاع اور تین صاع کے بدلے اس کے دو صاع وصول کرتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا ایسا نہ کرو ان ردی کھجوروں کو نقد درہموں سے بیچو پھر ان درہموں سے اعلیٰ کھجوریں خریدو اور یہی ہدایت وزن کی جانے والی اشیاء کے متعلق فرمائی۔''

۲۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں اشیاء کے مابین خاصیت کے فرق (Quality) کو نظر انداز کر دیا جائے۔

ربا الفضل کیوں حرام ہے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کوالٹی میں فرق کی بنیاد پر کمی بیشی کے ساتھ تبادلے میں بظاہر کوئی خرابی نظر نہیں آتی کیونکہ اعلیٰ درجے اور کم تر درجے کی چیز برابر نہیں پھر شریعت نے اسے کیوں حرام قرار دیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے انسان میں سود خوری کی ذہنیت پرورش پانے کا اندیشہ تھا۔ دین اسلام کا یہ طرہ امتیاز ہے کہ جب وہ کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اس تک پہنچنے کے تمام راستے اور ذرائع بھی بند کر دیتا ہے چنانچہ نبی ﷺ نے اس کی یہ حکمت خود ہی بیان فرما دی ہے۔

((لَا تَبِيْعُوا الدِّيْنَارَ بِالدِّيْنَارَيْنِ وَلَا الدِّرْهَمَ بِالدِّرْهَمَيْنِ وَلَا الصَّاعَ بِالصَّاعَيْنِ فَإِنِّيْ أَخَافُ عَلَيْكُمُ الرَّمَاءَ وَالرَّمَاءُ هُوَ الرِّبَا))

[مسند احمد: ٦٠٢٥]

''ایک درہم کو دو درہم اور ایک صاع کو دو صاع کے عوض نہ بیچو کیونکہ مجھے خوف ہے کہ

کہیں تم سود خوری میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔''

بظاہر یکساں چیزوں کا تبادلہ:

ایسی اشیاء جو بظاہر یکساں ہوں ان کے باہمی تبادلہ کی تین صورتیں ممکن ہیں:

۱۔ دونوں کی جنس ایک ہو۔

۲۔ جنس اور صنف مختلف ہو۔

۳۔ جنس ایک ہو، مگر صنف مختلف ہو۔

پہلی صورت میں کمی بیشی منع ہے اور ادھار بھی، دوسری صورت میں کمی بیشی اور ادھار دونوں جائز ہیں، تیسری صورت میں کمی بیشی جائز ہے مگر ادھار درست نہیں۔

ربا الفضل کا دائرہ:

ربا الفضل کی ممانعت کی احادیث میں صرف چھ مخصوص چیزوں کا ذکر ہے۔

(۱) سونا (۲) چاندی (۳) گندم

(۴) جو (۵) کھجور (۶) نمک

بعض روایات میں خشک انگور (منقیٰ) کا ذکر بھی ہے کیا یہ ممانعت صرف انہی چیزوں کے ساتھ خاص ہے یا ان کے علاوہ باقی اشیاء بھی اس میں شامل ہیں؟ اس کے متعلق فقہاء رحمہم اللہ کا اختلاف ہے۔

ہماری رائے میں سونے، چاندی میں علت قیمت ہے اور باقی چیزوں میں قابل غذا و ذخیرہ ہونا۔ جہاں یہ علت پائی جائے گی وہاں دو ایک طرح کی چیزوں کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ ناجائز ہوگا البتہ حدیث میں جانوروں کے متعلق رخصت آئی ہے کہ ایک جانور کی جگہ دو لینا درست ہے۔

اسی طرح سونا خام شکل میں ہو اور دوسری طرف زیور ہو تو ایسی صورت میں بھی کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ ہو سکتا ہے، کیونکہ زیور پر اضافی محنت خرچ ہوتی ہے لہٰذا اس کا اضافی معاوضہ لینا جائز ہے۔

کیا ربا کی حقیقت واضح نہیں؟

بعض حلقوں کی جانب سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن وحدیث میں ربا کی کوئی جامع مانع تعریف بیان نہیں ہوئی اس لیے کسی چیز کو ربا قرار دینا ہماری اپنی صواب دید پر منحصر ہے ان حضرات کی طرف سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمان کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے:

((إِنَّ آخِرَ مَا نَزَلَتْ آيَةُ الرِّبَا وَإِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُبِضَ وَلَمْ يُفَسِّرْهَا لَنَا فَدَعُوا الرِّبَا وَالرِّيبَةَ)) [سنن ابن ماجه: كتاب التجارات ، باب التغليظ فی الربا]

''سب سے آخری آیت جو نازل ہوئی وہ ربا کی آیت ہے اللہ کے نبی ﷺ فوت ہو گئے اور اس کی تفسیر بیان نہ کر سکے لہٰذا تم ربا بھی چھوڑ دو اور شک والی چیزیں بھی۔''

لیکن درج ذیل وجوہ کے باعث ان حضرات کا استدلال انتہائی کمزور ہے۔

۱۔ قرآن کا اسلوب عام فنی کتب سے بالکل مختلف ہے اس میں کسی چیز کی بھی فقہی اور قانونی تعریف بیان نہیں ہوئی ،قرآن نے زنا کو قبیح ترین جرم قرار دیا ہے ،شراب اور جوئے کو حرام قرار دیا ہے لیکن ان میں سے کسی کی بھی تعریف بیان نہیں فرمائی ،کیا اس استدلال کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ قرآن نے ان گناہوں کی تعریف ذکر نہیں کی ،لہٰذا ان کا مفہوم متعین کرنا ہماری صواب دید پر منحصر ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ قرآن میں ان گناہوں کی تعریف اس لیے بیان نہیں ہوئی کہ یہ سب چیزیں اتنی واضح تھیں کہ بطور خاص ان کی تعریف کی ضرورت ہی نہ تھی ،قرآن کے مخاطبین ان کی حقیقت سے پوری طرح واقف تھے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے ربا کے مرتکب لوگوں کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے۔کیا یہ تصور کیا جا سکتا کہ اللہ نے مبہم غیر متعین عمل جس کی حقیقت ہی معلوم نہ ہو کے ارتکاب پر اعلان جنگ فرمادیا ہو؟

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۝﴾[البقرة:٢٨٦]

''اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''

۳۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فرمان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ربا کی حرمت آپ کی زندگی کے آخری ایام میں نازل ہوئی تھی۔اس کی حرمت تو اس سے کافی عرصہ پہلے نازل ہو چکی تھی، غالباً غزوہ احد کے فوراً بعد:

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَأْکُلُوا الرِّبٰوا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾[آل عمران:۱۳۰]

''اے ایمان والو! سود کو دگنا چوگنا کر کے مت کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم آخرت میں نجات پا سکو۔''

اس آیت میں صریحاً ربا کی ممانعت کا حکم ہے یہ آیت غزوہ احد کے فوراً بعد نازل ہوئی تھی بلکہ بعض روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ربا غزوہ احد سے پہلے ہی ممنوع قرار دیا جا چکا تھا۔مثلاً حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

((قَدِمَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیه وسلم وَنَحْنُ نَتَبَایَعُ هٰذَا الْبَیْعَ ، فَقَالَ مَا کَانَ یَدًا بِیَدٍ فَلَیْسَ بِهِ بَأْسٌ ، وَمَا کَانَ نَسِیئَةً فَلَا یَصْلُحُ))

[صحیح بخاری: کتاب المناقب ،باب کیف آخی النبی بین اصحابه]

''نبی ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے اور ہم یہ بیع کرتے تھے (ایک مخصوص بیع کی طرف اشارہ ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا: جو نقد بہ نقد ہو اس میں کوئی حرج نہیں اور جو ادھار ہو وہ درست نہیں۔''

((عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ أَنَّ عَمْرَو بْنَ أُقَیْشٍ کَانَ لَهُ رِبًا فِی الْجَاهِلِیَّةِ فَکَرِهَ أَنْ یُسْلِمَ حَتّٰی یَأْخُذَهُ فَجَاءَ یَوْمَ أُحُدٍ فَقَالَ أَیْنَ بَنُو عَمِّی قَالُوا بِأُحُدٍ قَالَ أَیْنَ فُلَانٌ قَالُوا بِأُحُدٍ قَالَ أَیْنَ فُلَانٌ قَالُوا بِأُحُدٍ فَلَبِسَ لَأْمَتَهُ وَرَکِبَ فَرَسَهُ ثُمَّ تَوَجَّهَ قِبَلَهُمْ فَلَمَّا رَآهُ الْمُسْلِمُونَ قَالُوا : إِلَیْكَ عَنَّا یَا عَمْرُو قَالَ إِنِّی قَدْ آمَنْتُ)) [ابو داؤد:باب فِیْمَنْ یُسْلِمُ وَیُقْتَلُ مَکَانَهُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ]

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عمرو بن اقیش رضی اللہ عنہ کا زمانہ جاہلیت میں کسی کے ذمہ سود تھا انہوں نے اس کی وصولی تک اسلام قبول کرنے کو ناپسند سمجھا، وہ جنگ احد کے دن آئے اور پوچھا میرے چچا زاد کہاں ہیں؟ جواب ملا: جنگ احد میں، پوچھا فلاں کہاں ہے؟ جواب دیا گیا: احد میں، انہوں نے پوچھا فلاں کہاں ہے؟ کہاں گیا: احد میں انہوں نے اسلحہ پہنا اور گھوڑے پر سوار ہو کر احد کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب مسلمانوں نے انہیں دیکھا تو کہنے لگے: اے عمرو! پیچھے ہٹ جاؤ، اس پر انہوں نے کہا: میں اسلام لا چکا ہوں۔''

۴۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمان سے ربا کا جواز ثابت کرنا ان کے مقصود کے صریح خلاف ہے کیونکہ ان کا مقصود یہ ہے کہ صرف صریح ربا ہی سے نہ بچو بلکہ ہر اس معاملے سے بچو جس میں ربا کا شائبہ بھی ہو اس سے ربا کا جواز نکالنا انتہائی درجے کی کم عقلی ہے۔

صحیحین، سنن ابی داوٗد، نسائی، ترمذی اور موطا میں حرمت ربا کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی بعض روایات ملاحظہ فرمائیں:

((اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ))

[بخاری: کتاب البیوع، باب ما یذکر فی بیع الطعام والحکرة]

''سونا سونے کے عوض، گندم گندم کے بدلے، کھجور کھجور کے اور جو جو کے بدلے سود ہے سوائے اس کے کہ برابر برابر اور نقد لین دین ہو۔''

((عَنْ مَالِكِ بْنِ أَوْسِ بْنِ الْحَدَثَانِ النَّصْرِيِّ أَنَّهُ الْتَمَسَ صَرْفًا بِمِائَةِ دِينَارٍ قَالَ فَدَعَانِي طَلْحَةُ بْنُ عُبَيْدِ اللّٰهِ فَتَرَاوَضْنَا حَتّٰى اصْطَرَفَ مِنِّي وَأَخَذَ الذَّهَبَ يُقَلِّبُهَا فِي يَدِهِ ثُمَّ قَالَ حَتّٰى يَأْتِيَنِي خَازِنِي مِنَ الْغَابَةِ .وَعُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَسْمَعُ .فَقَالَ عُمَرُ وَاللّٰهِ لَا تُفَارِقُهُ حَتّٰى

تَأْخُذَ مِنْهُ ثُمَّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم الذَّهَبُ بِالْوَرِقِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ وَالشَّعِيرُ بِالشَّعِيرِ رِبًا إِلَّا هَاءَ وَهَاءَ))

[مؤطا امام مالك ، باب ماجاء فى الصرف،صحيح بخارى: باب بيع الشعير بالشعير]

''مالک بن اوس بن حدثان نصری سے روایت ہے کہ انہوں نے سو دینار بھنانا چاہے کہتے ہیں مجھے طلحہ بن عبید اللہ نے بلایا، ہم متفق ہو گئے یہاں تک کہ انہوں نے مجھ سے بیع صرف کر لی اور وہ دینار پکڑ کر اپنے ہاتھ میں اچھالنے لگے، پھر کہا غابہ سے میرے خزانچی کے آنے تک انتظار کرو۔ اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ یہ بات سن رہے تھے۔ انہوں نے کہا جب تک اس سے وصول نہ کرلو اس سے جدا نہ ہونا، پھر عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے سونا چاندی کے بدلے سود ہے مگر یہ کہ نقد بنقد ہو، گندم گندم کے بدلے سود ہے مگر یہ کہ برابر اور نقد ہو۔ کھجور کھجور کے بدلے سود ہے مگر یہ کہ برابر اور نقد ہو، جو، جو کے بدلے سود ہے الا کہ برابر اور نقد ہوں۔''

ان دونوں روایتوں سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ربا کی حرمت اور حقیقت کے متعلق کوئی اشتباہ نہ تھا۔ ان کا اصل شبہہ یہ تھا کہ آیا اس کا دائرہ صرف انہی چیزوں تک محدود ہے جن کا حدیث میں ذکر ہے یا ان کے علاوہ دوسری چیزیں بھی اس میں شامل ہیں؟ اس کی تائید صحیح بخاری کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے۔

((ثَلَاثٌ وَدِدْتُ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يُفَارِقْنَا حَتّٰى يَعْهَدَ إِلَيْنَا عَهْدًا الْجَدُّ وَالْكَلَالَةُ وَأَبْوَابٌ مِنْ أَبْوَابِ الرِّبَا))

[صحيح بخارى: كتاب الاشربة ،باب ماجاء فى ان الخمر ماخامر العقل]

''تین چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق میری خواہش تھی کہ نبی ﷺ ان کی تفصیل بیان کرنے سے قبل ہم سے جدا نہ ہوتے۔ (۱) دادا کی وراثت کا مسئلہ (۲) کلالہ کی وراثت کا

مسئلہ (۳) ربا کے بعض مسائل۔"

غَرَرْ (uncertainty):

دوسرا اصول یہ ہے کہ معاملہ غرر سے مبرا ہو۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

((الـنَّهي عَنْ بَيْع الْغَرَر فَهُوَ أَصْل عَظِيم مِنْ أُصُول كِتَاب الْبُيُوع))

[شرح نووی علی مسلم : کتاب البیوع ،باب بطلان بیع الحصاة......]

"بیع غرر سے ممانعت کتاب البیوع کے اصول میں سے ایک عظیم اصول ہے۔"

اس اصول کی بنیاد وہ آیات ہیں جن میں باطل طریقے سے مال کھانے کی ممانعت ہے

علامہ ابن العربی رحمہ اللہ باطل کی تشریح میں فرماتے ہیں:

"اس میں وہ تمام بیوع شامل ہیں جو شرعاً حلال نہیں اور مقصود کے لیے مفید نہیں ہیں کیونکہ شریعت نے ان سے منع کیا ہے اور ان کے لین دین کو حرام قرار دیا ہے جیسے سود، غرر وغیرہ ہیں۔" [احکام القرآن : ج ۱ ص ۱۱۱]

غرر کے متعلق ذیل کی احادیث ملاحظہ فرمائیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((نَهـى رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ الْحَصَاةِ وَعَنْ بَيْعِ الْغَرَرِ))[صحیح مسلم: کتاب البیوع، با ب بطلان بیع الحصاة]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکری کی بیع اور بیع غرر سے منع فرمایا۔"

سعید بن مسیب رحمہ اللہ تابعی کہتے ہیں:

((أَنَّ رَسُـوْلَ الـلّٰـهِ صَـلَّـى الـلّٰـهُ عَـلَيْـهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْ بَيْعِ الْغَرَرِ))

[موطاامام مالك : کتا ب البیو ع، باب بيع الغرر]

"بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع غرر سے منع فرمایا۔"

آخری روایت مرسل ہے جو سعید بن مسیب رحمہ اللہ تابعی براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل

کر رہے ہیں جمہور کے نزدیک ایسی روایت کو دلیل بنانا درست نہیں لیکن چونکہ اوپر کی دو روایتیں اس کی تائید کر رہی ہیں اس لیے ہم نے اس کو بھی یہاں بیان کر دیا ہے۔

غرر کا معنی:

مذکورہ بالا روایات میں معاملے کے غرر سے پاک ہونے کو بطور ایک اصول کے بیان کیا گیا ہے احادیث میں جن بیوع کے نام لے کر منع کیا گیا ہے ان میں سے بیشتر کی وجہ غرر ہی ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لغت اور علمائے حدیث وفقہ کے حوالے سے غرر کی حقیقت بھی واضح کر دی جائے۔

لغت میں غرر کا معنی دھوکہ دینا، غلط امید دلانا ہے:

ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ غرر کی تعریف یوں کرتے ہیں:

((هُوَ مَا كَانَ لَهُ ظَاهِرٌ يَغُرُّ الْمُشْتَرِيَ وَبَاطِنٌ مَجْهُوْلٌ))

[النهاية: ج۳ ص ٦٦١]

’’جس کا ظاہر مشتری کو دھوکہ دے اور باطن مجہول ہو۔‘‘

المعجم الوسيط میں ہے:

((بيع الغرر بيع ما يجهله المتبايعان او مالا يتوثق بتسلمه))

’’وہ بیع جس سے دونوں بیع کرنے والے ناواقف ہوں یا اس کے حوالے کرنے کا یقین نہ ہو، بیع غرر ہے۔‘‘

ازہری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

’’بیع غرر میں وہ تمام بیوع داخل ہیں جن کی حقیقت سے بیع کرنے والے ناواقف ہوں۔‘‘ [لسان العرب]

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ ابن عرفہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

((الغرر هو ما كان ظاهره يغر وباطنه مجهول)) [عمدة القاری شرح صحیح بخاری: ج۱۷ ص ٤٧١]

''جس کا ظاہر دھوکے میں مبتلا کرے مگر اس کا باطن مجہول ہو۔''

نیز صاحب مشارق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''بیع غرر مخاطرہ کو کہتے ہیں بیع مخاطرہ وہ ہے جس میں قیمت یا چیز یا اس کا سلامت ہونا یا اس کی مدت واضح نہ ہو۔''

نامور محدث امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((کل بیع کان المقصود منه مجهولا غیر معلوم ومعجوزا عنه غیر مقدور علیه فهو غرر وذلك مثل ان یبیعه سمکا فی الماء او طیرا فی الهواء لؤلؤا فی البحر او عبدا ابقا او جملا شاردا او ثوبا فی جراب لم یره ولم ینشره او طعاما فی بیت لم یفتحه او ولد بهیمة لم تولد او ثمر شجرة لم تثمر وفی نحوها من الامور التی لاتعلم ولا یدری هل تکون ام لا فان البیع فیها مفسوخ وانما نهی صلی الله علیه وسلم عن هذه البیوع تحصینا للاموال ان تضیع وقطعا للخصومة والنزاع ان یقعا بین الناس فیها وابواب الغرر کثیرة وجماعها ما دخل فی المقصود منه الجهل)) [معالم السنن: ج۳ ص ۶۷۲]

''ہر وہ بیع جس میں مقصود مجہول، نامعلوم اور دائرہ قدرت سے باہر ہے وہ غرر ہے اس کی مثال پانی میں مچھلی، ہوا میں پرندے سمندر میں لؤلؤ، بھاگے ہوئے غلام، بپھرے ہوئے اونٹ، تھیلی میں بند کپڑے، جنہیں دیکھا نہ گیا ہو یا مقفل کمرے میں غلہ، جانور کا ایسا بچہ جو ابھی پیدا نہ ہوا ہو، درخت کے ایسے پھل جو ابھی وجود میں نہ آئے ہوں اور اس طرح کی دوسری چیزیں جو نامعلوم ہوتی ہیں اور جن کے متعلق یہ علم نہیں ہوتا کہ ہوں گی یا نہیں تو اس کی خرید و فروخت منع ہے۔ نبی ﷺ نے ایسی خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے تاکہ لوگوں کے مال ضائع ہونے سے محفوظ رہیں اور لوگوں کے درمیان جھگڑا پیدا نہ ہو۔ غرر کے ابواب بہت زیادہ ہیں اور ان کے لب لباب یہ ہے کہ جہاں مقصود میں جہالت آجائے وہ غرر ہے۔''

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

((وَيَدْخُلُ فِيهِ مَسَائِلُ كَثِيرَةٌ غَيْرُ مُنْحَصِرَةٍ كَبَيْعِ الْآبِقِ وَالْمَعْدُومِ وَالْمَجْهُولِ وَمَا لَا يَقْدِرُ عَلَى تَسْلِيمِهِ وَمَا لَمْ يَتِمَّ مِلْكُ الْبَائِعِ عَلَيْهِ وَبَيْعِ السَّمَكِ فِي الْمَاءِ الْكَثِيرِ وَاللَّبَنِ فِي الضَّرْعِ وَبَيْعِ الْحَمْلِ فِي الْبَطْنِ وَبَيْعِ بَعْضِ الصُّبْرَةِ مُبْهَمًا وَبَيْعِ ثَوْبٍ مِنْ أَثْوَابٍ وَشَاةٍ مِنْ شِيَاهٍ وَنَظَائِرِ ذَلِكَ ، وَكُلُّ هَذَا بَيْعُهُ بَاطِلٌ لِأَنَّهُ غَرَرٌ مِنْ غَيْرِ حَاجَةٍ))

[شرح نووی علی مسلم: کتاب البیوع ،باب بطلان بیع الحصاۃ]

’’اس بیع غرر میں بہت سے مسائل داخل ہیں جیسے بھاگے ہوئے غلام، معدوم ومجہول اور اس کی فروخت جس کے حوالے کر سکنے کی قدرت نہ ہو اور جس پر بیچنے والے کی ملکیت نہ ہو کثیر پانی میں مچھلی، جانور کے تھنوں میں دودھ، حمل، ڈھیر کے کچھ حصہ کی مبہم کپڑوں میں سے کسی ایک کپڑے اور بکریوں میں سے کسی ایک بکری کی اور اس طرح کی دیگر چیزوں کی فروخت تو یہ سب باطل ہیں کیونکہ یہ ایسا غرر ہے جس کی ضرورت نہیں۔‘‘

مزید لکھتے ہیں:

((وَاعْلَمْ أَنَّ بَيْعَ الْمُلَامَسَةِ وَبَيْعَ الْمُنَابَذَةِ وَبَيْعَ حَبَلِ الْحَبَلَةِ وَبَيْعَ الْحَصَاةِ وَعَسْبَ الْفَحْلِ وَأَشْبَاهَهَا مِنَ الْبُيُوعِ الَّتِي جَاءَ فِيهَا نُصُوصٌ خَاصَّةٌ هِيَ دَاخِلَةٌ فِي النَّهْيِ عَنْ بَيْعِ الْغَرَرِ وَلَكِنْ أُفْرِدَتْ بِالذِّكْرِ ، وَنُهِيَ عَنْهَا لِكَوْنِهَا مِنْ بِيَاعَاتِ الْجَاهِلِيَّةِ الْمَشْهُورَةِ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ))

[شرح نووی علی مسلم: کتاب البیوع ،باب بطلان بیع الحصاۃ]

’’جان لو! بیع ملامسہ، منابذہ، حبل الحبلہ، بیع حصاۃ، عسب فحل اور اس طرح کی دوسری بیع جن کے متعلق خاص نصوص وارد ہیں وہ بیع غرر کی ممانعت میں داخل ہیں لیکن اس کا الگ ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ جاہلیت کی مشہور بیوع میں سے ہیں۔‘‘

شارح بخاری علامہ ابن بطال کہتے ہیں:

((وقد ذکرنا ان الغرر ھو ما یجوز ان یوجد وان لا یوجد))

[شرح بخاری ابن بطال: ج ۱۱ ص ۲۸۲]

''ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ غرر وہ ہے جس کے ہونے اور نہ ہونے دونوں کا احتمال ہو۔''

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ غرر کی تشریح میں لکھتے ہیں:

((وھذا کبیع العبد الابق الذی لا یقدر علیٰ تسلیمہ والفرس الشارد والطیر فی الھواء......ونحو ذلك مما لا یعلم حصولہ او لا یقدر علی تسلیمہ او لا یعرف حقیقتہ ومقدارہ ومنہ بیع حبل الحبلة ...... ومنہ بیع الملامسة والمنابذة)) [زاد المعاد ، بیع الغرر: ج ۵ ص ۷۲۵]

''اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز کو حوالے نہ کیا جا سکتا ہو یا جس کی حقیقت اور مقدار معلوم نہ ہو وہ بیع غرر میں شامل ہے۔ بیع حبل الحبلہ، ملامسہ، منابذہ اسی نوعیت کی ہے۔''

امام الہند شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وھو الذی یتیقن انہ موجود او لا))[حجة البالغة: ج ۲ ص ۱۹۴]

''جس کے ہونے یا نہ ہونے کا یقین نہ ہو۔''

شارح ترمذی علامہ مبارک پوری رحمہ اللہ غرر کی تشریح میں رقم طراز ہیں:

((مَا لَا يُعْلَمُ عَاقِبَتُهُ مِنَ الْخَطَرِ الَّذِي لَا يُدْرَى أَيَكُونُ أَمْ لَا كَبَيْعِ الْآبِقِ وَالطَّيْرِ فِي الْهَوَاءِ وَالسَّمَكِ فِي الْمَاءِ ، وَالْغَائِبِ الْمَجْهُولِ وَمُحَمَلُهُ أَنْ يَكُونَ الْمَعْقُودُ عَلَيْهِ مَجْهُولًا أَوْ مَعْجُوزًا عَنْهُ)) [تحفة الاحوذی: ابواب البیوع،باب ماجاء فی کراھیة بیع الغرر]

''اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مقصود مجہول یا حوالے نہ کیا جا سکتا ہو تو وہ غرر ہے۔''

مذکورہ بالا تفصیل سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں:

۱۔ پہلی بات تو یہ ثابت ہوتی ہے کہ لغت میں علمائے حدیث وفقہ کے ہاں غرر کا لفظ بڑا

وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ ایک حدیث میں پانی میں مچھلی کی بیع کو بھی غرر قرار دیا گیا ہے۔

((لاتشتروا السمك فى الماء فانه غرر)) [مسند احمد]

۲۔ دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ جو چیز مشتری کے حوالے نہ کی جاسکتی ہو یا اس میں جہالت پائی جائے تو اس کا کسی سے بیع کا معاملہ کرنا جائز نہیں۔ خواہ جہالت خود چیز یا اس کی جنس، نوع، صنف، مقدار، قیمت یا اجل میں پائی جائے یا عقد کے الفاظ میں۔

بیع کی ذیل کی اقسام اسی قبیل سے ہیں:

- بیعتین فی بیعة: یعنی فروخت کرنے والا یہ کہے: ''یہ چیز نقد سو کی اور ادھار ایک سو دس کی بشرطیکہ کسی ایک قیمت کا تعین نہ ہو۔
- بیع الحصاة: یہ کہنا کہ: ''میں یہ کنکری پھینکتا ہوں یہ جس کپڑے پر لگے میں وہ آپ کو اتنے کا فروخت کرتا ہوں یا یہ کہنا کہ یہ کنکری یہاں سے جہاں تک جائے وہ زمین اتنی قیمت میں فروخت کرتا ہوں۔''
- بیع ملامسة: صرف خریدار کے چیز کو ہاتھ لگانے سے بیع مکمل ہو جائے دیکھنے کی اجازت نہ ہو۔
- بیع منابذة: فریقین میں سے ہر ایک اپنی اپنی چیز پھینکے اور یہ پھینکنا ہی فروخت قرار پائے۔
- بیع معلق: جس میں ملکیت کا ثبوت کسی ایسے واقعہ سے جوڑا گیا ہو جس کے ہونے اور نہ ہونے دونوں کا احتمال ہو۔ قمار، لاٹری، اور انشورنس اسی قبیل سے ہیں۔

۳۔ اس تفصیل سے تیسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ جہالت کی تمام اقسام غرر میں شامل ہیں البتہ بعض علماء جہالت کو غرر سے الگ بھی قرار دیتے ہیں۔

غرر کا دائرہ:

حدیث اور فقہاء کے کلام میں جہاں غرر کی ممانعت آئی ہے وہ اگرچہ بیع کے متعلق ہے لیکن فقہاء نے دوسرے مالی معاملات (از قسم معاوضات) کو بھی اس پر قیاس کر کے ان کے

غرر سے پاک ہونے کی شرط لگائی ہے۔

مشکوک معاملات سے بھی پرہیز ضروری ہے:

مزید برآں ان معاملات سے بھی بچنے کا حکم ہے جو شریعت کے ایک اصول کی روشنی میں تو جائز مگر کسی دوسرے اصول کی روشنی میں ناجائز ہوتے ہیں۔اس موضوع کی بعض احادیث ملاحظہ ہوں۔

❁ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا:

((اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ ، وَبَيْنَهُمَا مُشَبَّهَاتٌ لَا يَعْلَمُهَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ ، فَمَنِ اتَّقَى الْمُشَبَّهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهِ وَعِرْضِهِ ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ كَرَاعٍ يَرْعَى حَوْلَ الْحِمَى ، يُوْشِكُ أَنْ يُوَاقِعَهُ))

[صحيح بخاري: كتاب الايمان، باب فضل من استبرء لدينه]

''حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان کے درمیان کچھ مشتبہ امور ہیں جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔جو شخص شبہات سے بچا اس نے اپنا دین اور عزت بچا لی۔اور جو شبہات میں پڑ گیا اس کی مثال اس چرواہے کی ہے جو (شاہی) چراگاہ کے آس پاس (اپنے جانور) چراتا ہے،قریب ہے اس میں جا گھسے۔''

❁ حضرت عطیہ سعدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ أَنْ يَكُوْنَ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ حَتَّى يَدَعَ مَا لَا بَأْسَ بِهِ حَذَرًا لِمَا بِهِ الْبَأْسُ)) [سنن ترمذى باب لا يبلغ العبد أن]

''بندہ اس وقت تک پرہیز گار نہیں بن سکتا جب تک حرج والی چیزوں کے خوف سے وہ چیزیں بھی نہ چھوڑ دے جن میں کوئی حرج نہیں''

یہ دونوں احادیث اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ صریح حرام کے علاوہ مشتبہ معاملات سے بھی اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ اس طرح حرام میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہیں رہتا۔اور یہی تقویٰ کا تقاضا ہے۔

خلاصہ

- جو چیز قابل انتفاع یا انسان کی ملکیت و قبضہ میں نہ ہو اس کی خرید و فروخت نہیں ہو سکتی۔
- خرید و فروخت کی جس صورت میں سود اور غرر کی آمیزش ہو یا ایک عقد میں دو عقد جمع ہو رہے ہوں یا شرط فاسد یا دو شرطیں پائی جا رہی ہوں وہ جائز نہیں۔
- تقوی کا تقاضا یہ ہے کہ مشتبہ معاملات سے بھی بچا جائے۔

باب سوم

مروجہ معاملات کی تفصیل

جب ہم پیچھے بیان کردہ اصول کی روشنی میں دورِ حاضر کے مالی معاملات کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کے جواز یا عدم جواز میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ ذیل میں ہم بعض معاملات کا ذکر کرتے ہیں۔

کریڈٹ کارڈ:

ان میں سرفہرست کریڈٹ کارڈ کا استعمال ہے جو عصر حاضر میں ایسی کرنسی کا روپ دھار چکا ہے جو پوری دنیا میں یکساں طور پر استعمال ہوسکتی ہے۔

کریڈٹ کارڈ کی حقیقت:

کریڈٹ کارڈ کو عربی میں ''بطاقة الائتمان'' کہا جاتا ہے۔ جس کا لغوی معنی ہے ''اعتبار، اعتماد اور قرض کا کارڈ'' جدید معاشی ماہرین کی اصطلاح میں اس سے مراد وہ مخصوص کارڈ ہے جو کسی مالیاتی ادارے کی جانب سے جاری کیا جاتا ہے۔ جس پر کسٹمر کا نام، تاریخ اجراء واختتام اور کارڈ کا نمبر وغیرہ لکھا ہوتا ہے۔ اور یہ ایسے سائز اور میٹریل کا ہوتا ہے جو آسانی سے جیب میں رکھا جاسکتا ہے۔ اس کا حامل خریداری کے مخصوص مراکز پر یہ کارڈ دکھا کر اپنی ضرورت کی اشیاء خرید سکتا ہے۔ جن کا بل خریداری کرنے والے کی بجائے کارڈ جاری کرنے والا ادارہ کرتا ہے۔ جو بعد میں اس سے وصول یا اس کے اکاؤنٹ سے منہا کر لیا جاتا ہے۔ اگر صارف معینہ مدت کے اندر ادائیگی نہ کر سکے تو اس پر سود وصول کیا جاتا ہے۔ جس کا تعین واجب الاداء رقم کے حساب سے کیا جاتا ہے اور اس کی شرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ واضح رہے کہ صارف سے وصولی کی مدت عموماً ایک ماہ سے زیادہ تو ہوسکتی ہے لیکن کم نہیں۔

کریڈٹ کارڈ کی تاریخ:

بیسویں صدی کا آغاز کریڈٹ کارڈ کا ابتدائی دور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے کریڈٹ کارڈ کا استعمال ۱۹۱۴ء میں امریکہ میں کیا گیا جو مختلف برانچز (Branches) رکھنے والے ہوٹل اور تیل کمپنیوں نے اپنے گاہکوں کو استعمال کے لیے دیا۔[البطاقات الدائنية للدكتور محمد بن سعود العصيمي: ص٢٦]

لیکن اس کا زیادہ استعمال دوسری جنگ عظیم کے بعد اس وقت بڑھا جب مختلف مالیاتی اداروں نے اس کو جاری کرنا شروع کیا۔

۱۹۴۷ء میں The Flat Bus National Band پہلا بینک ہے جس نے یہ کارڈ جاری کیا۔ ۱۹۵۱ء میں Dinners Clib نے پہلا عالم گیر سطح کا کارڈ جاری کیا جو نیویارک میں ہوٹلوں اور دوسرے کاروباری مقامات پر یکساں استعمال ہونے لگا اس کے بعد امریکن ایکسپریس اور Blannch Carte کارڈ سامنے آیا۔[الخدمات المصرفية للدكتور علاء الدين الزعترى :ص٥٥٩،٥٦٩]

۱۹۵۸ء میں بینک آف امریکا نے کیلفورنیا میں Bank Americarad کے نام تبدیل کر کے Viza Card رکھ دیا گیا اور اس کے تحت جاری ہونے والے کارڈ کو ویزا کہا جانے لگا جو اس وقت سب سے مشہور کارڈ شمار ہوتا ہے۔ اس کے بعد جو کارڈ زیادہ تیزی سے پھیلا وہ ماسٹر کارڈ ہے ان کے علاوہ دیگر کارڈ بھی زیر گردش ہیں مگر زیادہ معروف اور زیر استعمال یہی دو ہیں اسلامی ممالک میں اس کا استعمال بیسویں صدی کے آخر میں یعنی ۱۹۹۰ء کے بعد شروع ہوا۔ اس کی بڑھتی ہوئی مانگ کو دیکھتے ہوئے چھوٹے بینک بڑے بینکوں سے تعلقات استوار کرنے لگے تاکہ اس کے استعمال کو وسعت دی جاسکے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں سود کا عنصر ۱۹۷۰ء میں داخل کیا گیا۔ اس سے پہلے صرف سروس چارجز (Serviec Chrges) کے نام پر سالانہ فیس وصول کی جاتی تھی۔

کارڈز کی مختلف قسمیں:

مختلف مالیاتی ادارے اور کمپنیاں اپنے صارفین کی سہولت کے لیے جو کارڈز جاری کرتیں ہیں مختلف اعتبار سے ان کی مختلف قسمیں ہیں لیکن بنیادی قسمیں دو ہی ہیں۔

۱۔ سودی

۲۔ غیر سودی

(۱) سودی:

جن پر تاخیر کی صورت میں جرمانہ عائد ہوتا ہے عام کریڈٹ کارڈ اور چارج کارڈ اسی قسم سے ہیں۔ چارج کارڈ کو عربی میں ''بطاقة الائتمان العادية'' یا ''بطاقة الخصم الشهري'' کہا جاتا ہے اس میں اور کریڈٹ کارڈ میں فرق ہے وہ یہ کہ چارج کارڈ میں مقررہ مدت کے اندر مکمل ادائیگی ضروری ہوتی ہے۔ قسط کی سہولت نہیں ہوتی تاخیر کی صورت میں جرمانہ وصول کرنے کے علاوہ کارڈ بھی منسوخ کر دیا جاتا ہے جبکہ کریڈٹ کارڈ میں پوری رقم یک مشت واپس کرنا ضروری نہیں ہوتی قسط کی سہولت بھی ہوتی ہے تاہم اس پر سود ادا کرنا ہوتا ہے۔

(۲) غیر سودی:

اس سے مراد "Debit Card" ہے یہ کارڈ صرف اس کو جاری کیا جاتا ہے جس کا اس بینک میں جس سے کارڈ لیا جا رہا ہے بیلنس موجود ہو۔ جب اس کارڈ کے ذریعے خریداری کی جاتی ہے تو اس کے اکاؤنٹ سے اتنی رقم از خود متعلقہ تاجر کے کھاتے میں منتقل ہو جاتی ہے۔ یعنی اس کارڈ کا حامل اصل میں اپنی رقم ہی استعمال کرتا ہے بینک صرف اس پر سروس چارجز (Service Charges) وصول کرتا ہے۔ ڈیبٹ کارڈ کا حامل اپنے بیلنس سے زائد خریداری نہیں کر سکتا الا کہ بینک کی طرف سے پیشگی اجازت ہو۔ یہ کارڈ عموماً ملک کے اندر ہی استعمال ہوتا ہے۔ اس میں ادائیگی میں تاخیر اور جرمانہ کا اندیشہ نہیں ہوتا۔

کارڈز کے فوائد:

کارڈز میں تین فریق ہوتے ہیں:

۱۔ مالیاتی ادارہ یا بینک جو کارڈ جاری کرتا ہے

۲۔ خریداری کے وہ مراکز جہاں کارڈ قبول کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کارڈ ہولڈر

کارڈ کے استعمال سے تینوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔

بینک کو حاصل ہونے والے فوائد:

- جائننگ فیس: بینکوں کے درمیان سخت مسابقت اور مقابلے کی وجہ سے بعض بینک یہ فیس وصول نہیں کرتے اور مفت کریڈٹ کارڈ فراہم کرتے ہیں۔
- سالانہ فیس: جسے بینک کی طرف سے Service Charges کا نام دیا جاتا ہے۔
- تاجر سے وصول ہونے والا کمیشن۔
- کارڈ گم یا چوری ہو جائے تو نیا کارڈ جاری کروانے کی فیس۔
- ادائیگی میں تاخیر کی بنا پر کارڈ ہولڈر سے وصول کی جانے والی اضافی رقم۔

تاجر کا فائدہ:

- تجارت کا فروغ: کیونکہ کارڈ ہولڈر خریداری کے لیے انہی مراکز کا رخ کرتے ہیں جو کارڈ قبول کرتے ہیں۔
- رقم کی وصولی کا اطمینان۔

کارڈ ہولڈر کو پہنچنے والے فوائد:

- رقم جیب میں لے کر گھومنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس طرح رقم چوری ہونے یا ضائع ہونے کا خطرہ نہیں ہوتا، کارڈ گم یا چوری ہونے کی صورت میں بینک کو اطلاع کر دی جائے تو کوئی دوسرا استعمال نہیں کر سکتا۔

- ادائیگی میں آسانی: ایک ماہ سے لے کر ڈیڑھ ماہ تک مہلت مل جاتی ہے۔
- اگر کارڈ کے ذریعے سفری ٹکٹ خریدا گیا ہو تو حادثے کی صورت میں انشورنس (Insurance) کی سہولت۔

کارڈز کے نقصانات:

کارڈز کے کچھ نقصانات بھی ہیں جو صرف کارڈ ہولڈر کے حصہ میں آتے ہیں۔

- اکثر لوگ بغیر سوچے سمجھے ایسی چیزیں خرید لیتے ہیں جن کی فوری ضرورت نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی آئندہ کچھ عرصہ کے لیے خریدنے کے متحمل ہو سکتے ہیں۔اس طرح بچت کی عادت ختم ہو جاتی ہے اور لوگ قرض تلے دب جاتے ہیں چنانچہ مجموعی طور پر معیشت پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ایک رپورٹ کے مطابق امریکی اور یورپی عوام میں شائد ہی کوئی ایسا شہری ہو جس نے بینکوں کی قسطیں ادا نہ کرنی ہوں۔کریڈٹ کارڈ نے ان ترقی یافتہ اقوام کو مقروض اقوام میں بدل دیا ہے۔
- حامل کارڈ کی خاصی رقم فیس کی نذر ہو جاتی ہے۔پاکستان میں ''سٹینڈرڈ چارٹرڈ بینک'' نے ''گولڈن ماسٹر کریڈٹ کارڈ'' کی سالانہ فیس ۴۰۰۰ روپے رکھی ہے۔
- اصل میں یہ ایک سودی معاہدہ ہوتا ہے۔جس میں شامل ہونا ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں۔
- جن مراکز سے کریڈٹ کارڈ کے ذریعے خریداری کی جاتی ہے وہ عموماً دوسرے کاروباری مراکز سے مہنگے ہوتے ہیں۔

کریڈٹ اور چارج کارڈز کا شرعی حکم:

اگر کریڈٹ اور چارج کارڈز کی حقیقت پر غور کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں درحقیقت قرض کے کارڈز ہیں، کریڈٹ کارڈ میں طویل مدت کا قرض ہے جبکہ چارج کارڈ مختصر مدت کا۔چونکہ ان میں تاخیر پر جرمانہ وصول کیا جاتا ہے جو زمانہ جاہلیت کے سود''اما ان تقضی واما ان تربی''کے مشابہ ہے۔جس سے قرآن نے سختی سے روکا ہے۔

لہٰذا ان کا استعمال شرعاً جائز نہیں ہے۔

علامہ بکر بن عبداللہ ابوزید رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((ان بطاقة الائتمان بوضعها العام المعروف عالميا والمحتوية على شروط ومواصفات قطعية التحريم،مثل:غرامات التاخير والخصم الذي يقتصه البنك......المصدر لها......من فاتورة التاجر الموقعة من العميل ،وتوفير قدر من المنافع لحاملها كالتخفيض ،والخدمات الاخرى،هذه((البطاقة الائتمانية))محرما شرعا)) [بطاقة الائتمان : ص٥٦]

''بلاشبہ وہ کریڈٹ کارڈ جو عام صورت میں عالمی سطح پر معروف ہے اور جو قطعی حرام شروط اور صفات پر مشتمل ہوتا ہے مثلاً ادائیگی کی تاخیر پر جرمانہ اور وہ کٹوتی جو کارڈ جاری کرنے والا بینک تاجر کے بل جس پر کارڈ ہولڈر کے دستخط ہوتے ہیں سے کرتا ہے اور وہ فوائد جو حامل کو ملتے ہیں جیسے ڈسکاؤنٹ وغیرہ یہ کارڈ شرعی طور پر حرام ہے۔''

بعض علماء کی رائے میں اگر یہ اطمینان کرلیا جائے کہ مقررہ مدت میں ادائیگی کردی جائے گی تو اس کے استعمال میں کوئی خرابی نہیں ۔لیکن بعض دوسرے علماء کے خیال میں یہ سودی معاہدہ ہے جس کا حصہ بننا جائز نہیں۔

ڈیبٹ کارڈ(Debit Card) کا استعمال جائز ہے:

ڈیبٹ کارڈ کو عربی میں ''بطاقة الحسم الفوري'' کہا جاتا ہے۔اس میں چونکہ کارڈ ہولڈر اپنا بیلنس ہی استعمال کرتا ہے اس وجہ سے جرمانے کا اندیشہ نہیں ہوتا لہٰذا اس کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں۔

چنانچہ علامہ بکر بن عبداللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((ان كل بطاقة لها غطاء كامل من مال حاملها فلاتسمح بالسحب الفوري،ولا التحويل الآلي الا على حسابه،ورصيده لدى

مصدرها،فهي بهذا الوصف جارية على الاصل الشرعي:الحل والجواز))[بطاقة الائتمان:ص ٥٥]

''ہر وہ کارڈ جس کے پیچھے کارڈ ہولڈر کی رقم بینک میں موجود ہو وہ جب بھی رقم نکالے یا خرچ کرے وہ اس کے اپنے کھاتے ہی سے ہو تو یہ شرعی اصول (معاملات میں اصل جواز ہے) کے مطابق جائز ہے۔''

بعض علماء کے نزدیک جب کوئی شخص ڈیبٹ کارڈ کے ذریعے خریداری کرتا ہے تو وہ دُکاندار کو بینک کے حوالے کرتا ہے کہ آپ یہ بل مجھ سے وصول کرنے کی بجائے بینک سے وصول پالیں۔اصطلاح میں اس کو حوالہ کہا جاتا ہے جو جائز ہے۔نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((اذا اتبع احدكم على ملي فليتبع))[صحيح البخاري كتاب الحوالة]

''جب تم میں سے کسی کو مالدار کے حوالہ کیا جائے تو وہ حوالے ہو جائے''

تاہم بینک کا تاجر سے کمیشن لینا محل نظر ہے۔کیونکہ بظاہر یہ ڈسکاؤنٹ بل آف ایکسچینج کے مشابہ ہے کیونکہ بینک تاجر کو کٹوتی کے بعد ادائیگی کرتا ہے یعنی کارڈ ہولڈر سے زیادہ وصول کرتا ہے مگر تاجر کو کم ادا کرتا ہے یہی سود ہے۔بعض حضرات اس کمیشن کو دلالی کی اجرت قرار دیتے ہیں لیکن یہ درست نہیں۔کیونکہ دلالی کا تصور اس سے مختلف ہے۔دلال کسٹمر کو قائل کرتا ہے بینک یہ کام نہیں کرتا۔

انشورنس (التامين):

عصر حاضر میں جو معاملات کثرت سے رائج ہیں ان میں انشورنس بھی ہے جو انسانی معاشرے کو اس طرح اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے کہ بعض دفعہ انسان نہ چاہتے ہوئے بھی قانوناً اس پر مجبور ہو جاتا ہے۔

انشورنس کی ابتدا:

انشورنس اگرچہ اپنی سادہ شکل میں صدیوں سے رائج ہے لیکن اس نے ایک مضبوط

نظام کی صورت انیسویں صدی عیسوی میں اختیار کی۔ اس کے بعد بیسویں صدی اس کی ترقی کا دور ہے جس میں اس کی مروجہ صورتیں سامنے آئیں، ذیل میں ہم اس کے ارتقائی دور کا مختصر خاکہ بیان کرتے ہیں۔

- کہا جاتا ہے کہ اس کا ابتدائی تصور بارہویں صدی عیسوی کے آخر میں Bottomry (بحری جہاز پر قرض کا عقد) کے نام سے سامنے آیا، جس کی صورت یہ تھی کہ تاجر کشتی کے مالک کو بحری سفر پر آمادہ کرنے کے لیے اتنا قرض دیتا جو کشتی اور اس پر موجود سامان کی قیمت کے برابر ہوتا۔ اگر کشتی بندرگاہ پر باحفاظت پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی تو کشتی کا مالک وہ رقم اضافے کے ساتھ واپس کرتا لیکن اگر سمندر میں غرق ہو جاتی تو تاجر کا قرض ضائع ہو جاتا۔
- بحری انشورنس کی پہلی باقاعدہ دستاویز ۲۳ اکتوبر ۱۳۴۷ء میں اٹلی میں لکھی گئی۔
- چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں جب اٹلی اور بحر روم کے ساحلی ممالک کے درمیان تجارت کو فروغ ملا تو انشورنس میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔
- بری انشورنس کی ابتدا سترھویں صدی عیسوی میں لندن سے ہوئی۔ جس کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۶۶۶ء میں لندن میں ایک خوف ناک آگ بھڑک اٹھی، جس سے تیرہ ہزار سے زائد مکانات، سو کے قریب گرجا گھر، بہت سی دُکانیں اور فیکٹریاں جل کر راکھ ہو گئیں۔ مستقبل میں ناگہانی نقصانات سے بچنے کی سوچ نے لوگوں کو انشورنس کی راہ دکھائی، وہ یہودی ساہوکار جو اٹلی سے نکلنے کے بعد لندن کو اپنا مرکز بنائے ہوئے تھے انہوں نے اس واقعے کو غنیمت جانا اور لوگوں کو آتش زدگی سے پہنچنے والے نقصان کا ازالہ کرنے کے لیے انشورنس کی ترغیبات دینا شروع کیں اس طرح اس کی متعدد صورتیں سامنے آئیں۔
- اٹھارویں صدی عیسوی میں انشورنس کا کاروبار پورے یورپ اور امریکی ریاستوں میں پھیل چکا تھا۔

- انیسویں صدی صنعتی ترقی کا دور ہے، اس میں انشورنس کی ایک نئی قسم ''تھرڈ پارٹی انشورنس'' (تامين ضد المسئولية) سامنے آئی۔
- اس کے بعد Mutual (التامين التبادلي) اور گڈز انشورنس متعارف ہوئیں۔
- انیسویں صدی کا آخر لائف انشورنس (تامين الحياة) کے متعارف ہونے کا زمانہ ہے۔
- اسلامی ممالک انیسوی صدی میں یورپی تاجروں کے توسط سے اس سے آشنا ہوئے، شام کے فقیہ علامہ ابن عابدین شامی پہلے عالم ہیں جنہوں نے ''سوکرہ'' کے نام سے اس کا ذکر کیا۔
- بعض مفکرین اس کا ابتدائی دور ۹۱۶ ق م بیان کرتے ہیں، جب روڈس (جزیرہ یونان) میں بحری تاجروں کے نقصان کی تقسیم کا نظام وضع کیا گیا۔
- بعض مفکرین کی رائے میں اس فکر کا بانی رومن ایمپائیر ہے، جس نے اپنی بحری فوجی قوت کو مضبوط کرنے کے لیے اسلحے کے تاجروں سے یہ وعدہ کیا کہ نقصان کی صورت میں حکومت تلافی کرے گی لیکن یہ درست نہیں، کیونکہ اس صورت میں تاجر سے کچھ وصول نہیں کیا جاتا، حکومت کی طرف سے جو کچھ دیا جاتا تھا وہ یک طرفہ ہوتا تھا۔ انشورنس میں یہ بات نہیں ہوتی۔ اس لیے اسے انشورنس کی بجائے ضمان کہنا چاہیے۔

انشورنس کا مفہوم:

انشورنس انگریزی زبان کے لفظ Insure سے ہے جو وثوق دلانے اور ضمانت کے معنی میں آتا ہے۔ انشورنس کا اطلاق ایسے معاملے پر ہوتا ہے جس میں کوئی شخص یا ادارہ دوسرے شخص کو یہ ضمانت دیتا ہے کہ مستقبل میں پیش آنے والے فلاں ممکنہ خطرات کے نقصان کی تلافی وہ کرے گا۔ چنانچہ اس شرط پر دوسرا شخص ایک معینہ مدت تک ایک مقرر رقم اقساط کی صورت میں ادا کرتا ہے۔ عربی میں انشورنس کے لیے ''تامین'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو ''امن'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی طمانیت قلب اور خطرے سے محفوظ رہنا ہے، انشورنس

کے ذریعے بھی انسان مستقبل کے خطرات سے محفوظ رہتا ہے، اس لیے اسے تامین کہتے ہیں۔

انشورنس کی قسمیں:

منتظم اداروں کے لحاظ سے اس کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) گروپ انشورنس:

حکومت ملازمین کی فلاح بہبود کے لیے ایک پالیسی ترتیب دیتی ہے جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ملازمین کی تنخواہ سے قانوناً کچھ رقم ہر ماہ ادائیگی سے قبل ہی وضع کر لی جاتی ہے جو ایک فنڈ میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ ملازم کی ریٹائرمنٹ، انتقال یا حادثے کی صورت میں خود ملازم یا اس کے ورثاء کو اضافے کے ساتھ واپس کر دی جاتی ہے پھر آگے اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ انشورنس کی یہ صورت غیر اختیاری ہے، جس سے قانونی مجبوری کی وجہ سے بچنا انسان کے اختیار میں نہیں ہے اس لیے اس پر اتفاق ہے کہ اس قسم کی انشورنس کرانے کی صورت میں انسان عنداللہ بری ہوگا البتہ اضافی رقم کے متعلق دو نقطہ نظر ہیں۔

- اکثر علماء کے خیال میں اس سے حکومت کا مقصد نفع کمانا نہیں بلکہ ملازمین سے تعاون ہوتا ہے اور حکومت کی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ ملازمین کی ضروریات کا خیال رکھے، اس لیے اضافی رقم وصول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔
- دوسری رائے یہ ہے کہ اضافی رقم ذاتی استعمال میں نہ لائی جائے بلکہ غرباء اور مساکین پر خرچ کر دی جائے۔

(۲) میوچل انشورنس:

اس کا انتظام امداد باہمی کی تنظیمیں کرتی ہیں۔ اس کا مقصد نقصان کی صورت میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا ہے نہ کہ تجارت اور دوسروں کے مال سے حصول نفع۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی ادارے، جماعت یا قبیلے کے لوگ باہم مل کر ایک فنڈ تشکیل دیتے ہیں اور کسی رکن کو حادثہ پیش آنے کی صورت میں اس فنڈ سے اس کی مدد کی جاتی ہے۔ اگر فنڈ

میں جمع شدہ رقم کم پڑ جائے تو اراکین سے مزید وصول کی جاتی ہے اور اگر بچ جائے تو آئندہ سال کے لیے جمع کر لی جاتی ہے۔ اس کی بنیاد سراسر تعاون پر ہے جس میں کوئی شرعی قباحت نہیں پائی جاتی۔ اس لیے انشورنس کی یہ قسم جائز اور مباح ہے۔

(۳) کمرشل انشورنس:

انشورنس کی اس قسم کا انتظام کاروباری کمپنیاں کرتی ہیں جن کے پیش نظر لوگوں سے مالی تعاون کی بجائے مال کمانا ہوتا ہے۔ اس کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ بیمہ ہولڈر کمپنی کو ایک متعین رقم اقساط کی صورت میں مخصوص مدت تک ادا کرتا ہے اس کے عوض بیمہ کمپنی اسے یہ یقین دہانی کرواتی ہے کہ کمپنی اس کے فلاں نوعیت کے نقصان کی تلافی کرے گی، انشورنس کی یہ قسم بطور کاروبار اختیار کی جاتی ہے، اس لیے اسے کمرشل انشورنس کہا جاتا ہے۔

جب انشورنس کا لفظ بغیر کسی اضافی قید کے ذکر کیا جائے تو اس سے یہی قسم مراد ہوتی ہے اور محل نزاع بھی یہی ہے۔ اس کی مزید بے شمار قسمیں ہیں اگر ان سب کو مختصراً بیان کیا جائے تو بنیادی طور پر ان کی تین قسمیں بنتی ہیں۔

لائف انشورنس:

انشورنس کمپنی کسی شخص سے یہ معاہدہ کرتی ہے کہ وہ ایک مقرر رقم اقساط کی صورت میں کمپنی کو ادا کرے گا۔ اگر معینہ مدت میں اس شخص کا طبعی یا حادثے میں انتقال ہو گیا تو کمپنی طے شدہ رقم اس کے ورثاء کو ادا کرے گی۔ اگر وہ شخص معینہ مدت تک زندہ رہے تو ادا شدہ رقم مع اضافہ کے ساتھ واپس مل جاتی ہے۔ اس کی بعض صورتوں میں مدت کا تعین ہوتا ہے اور بعض میں نہیں۔

گڈز انشورنس:

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص معینہ مدت کے لیے ایک مقررہ رقم قسطوں میں کمپنی کو ادا کرتا ہے اگر حادثے کی وجہ سے انشورنس کروائی گئی چیز کا نقصان ہو جائے تو ادا شدہ رقم واپس نہیں ہوتی، انشورنس کی ان دو قسموں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پہلی میں معینہ

مدت میں وفات نہ ہونے پر ادا شدہ رقم اضافے کے ساتھ مل جاتی تھی دوسری صورت میں رقم واپس نہیں ہوتی۔

تھرڈ پارٹی انشورنس:

انسان اپنی غلطی، غفلت یا سستی کی وجہ سے دوسرے شخص کو پہنچنے والے نقصان کی ذمہ داری سے بچنے کے لیے جو انشورنس کرواتا ہے اسے تھرڈ پارٹی انشورنس کہتے ہیں۔ مثلاً اس غرض سے گاڑی انشورنس کروانا کہ گاڑی سے نقصان کی صورت میں مالک کی بجائے انشورنس کمپنی اس کا ازالہ کرے۔

کمرشل انشورنس کا شرعی حکم:

درج ذیل خرابیوں کی بنا پر کمرشل انشورنس کی تمام شکلیں ممنوع ہیں۔

- ان میں ربا کی دونوں قسمیں ربا النسیئۃ اور ربا الفضل پائی جاتی ہیں کیونکہ انشورنس ہولڈر نے کمپنی کو متعین رقم اس شرط پر ادا کرنا ہوتی ہے کہ حادثے کی صورت میں کمپنی اس کو طے شدہ رقم ادا کرے گی، وہ رقم یا تو اس کی ادا کی ہوئی رقم سے زیادہ ہو گی یا کم۔ اگر زیادہ ہوگی تو اس میں ربا النسیئۃ اور ربا الفضل دونوں کی آمیزش ہوگی اور یہ دونوں حرام ہیں، کم ہونے کی صورت میں ربا النسیئۃ کا معاملہ قرار پائے گا۔
- یہ غرر پر مشتمل ہے کیونکہ اس میں ادائیگی ایک ایسے واقعہ پر منحصر ہوتی ہے۔ جس میں دونوں احتمال پائے جاتے ہیں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بیمہ ہولڈر نے ابھی کچھ قسطیں ہی ادا کی ہوں اور واقعہ پیش آجائے اس پر کمپنی کے ذمہ مکمل ادائیگی آجائے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ وہ واقعہ پیش نہ آئے اور اس کی تمام اقساط بغیر معاوضے کے کمپنی کے کھاتے میں چلی جائیں۔
- شرعی طور پر کسی پر ضمان لازم ہونے کی ایک ہی صورت ہے نقصان براہ راست اس نے کیا ہو یا کم از کم اس نقصان کا سبب بنا ہو، یہاں نہ تو انشورنس کمپنی نے نقصان کیا

ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اس کا سبب ہوتی ہے۔ لہٰذا اس پر ضمان لازم کرنا شرعاً جائز نہیں ،اس کو ''عقد موالات'' پر قیاس کرنا ''قیاس مع الفارق'' ہے۔

- ایک تو اس لیے کہ عقد موالات میں بنیادی شرط یہ ہے کہ عاقد کا کوئی وارث زندہ نہ ہو،اگر کوئی وارث ہوتو یہ باطل قرار پاتا ہے۔
- دوسرا اس لیے کہ انشورنس کا مقصد مادی فائدہ کا حصول ہے جس میں ربا اور غرر کی آمیزش ہے۔ جب کہ عقد موالات میں ہر طرح کے حالات میں تعاون مقصود ہوتا ہے۔
- تیسرا اس لیے کہ فقہاء کے ایک طبقہ کی رائے میں عقد موالات کا حکم اب باقی نہیں رہا بلکہ منسوخ ہو چکا ہے۔

لیزنگ:

مروجہ جدید مالی معاملات میں سے ایک لیزنگ بھی ہے لیز اصل میں عربی کے لفظ الاجارۃ کا ترجمہ ہے جو شرعی اصطلاح ہے لیکن مروجہ لیزنگ شرعی اجارہ سے مختلف ہے۔ شرعی اجارہ کا مفہوم تو صرف اتنا ہے۔

((بيع منفعة معلومة باجر معلوم)) [عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری: ج۱۸، ص ۲۵۱]

''طے شدہ اجرت کے بدلے طے شدہ منفعت فروخت کرنا''

اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ معاوضے کے بدلے کسی شخص (انجینئر وغیرہ) کی خدمات حاصل کرنا۔

۲۔ اپنی ذاتی چیز جیسے گاڑی یا مکان کا حقِ استعمال کسی دوسرے کی طرف منتقل کرنا اور اس کے عوض کرایہ وصول کرنا۔

جب لیزنگ کا لفظ بولا جاتا ہے تو اقتصادی ماہرین کے نزدیک اس سے عموماً اجارہ کی یہ آخری قسم ہی مراد ہوتی ہے۔

صحیح بخاری میں اجارہ کے عنوان کے تحت دونوں قسموں کا بیان ہے اجارہ کی اس قسم

میں چوں کہ چیز اصل مالک کی ملکیت ہی ہوتی ہے مستأجر کرایہ کے عوض صرف اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس لیے ملکیتی اخراجات مستاجر کے ذمے ہوں گے۔ مثلاً مکان کرائے پر دیا گیا ہے تو اس کی پراپرٹی ٹیکس مالک ادا کرے گا لیکن بجلی، گیس اور پانی کا بل مستاجر کے ذمہ ہوگا۔ اسی طرح اگر کرایہ پر دی گئی چیز کا ایسا نقصان ہو جائے جس میں مستاجر کی غلطی، غفلت یا کوتاہی کا عمل دخل نہ ہو تو وہ نقصان بھی مالک ہی برداشت کرے گا۔

لیزنگ کا جدید مفہوم:

اس کے برعکس انیسویں صدی عیسوی سے لیزنگ کی ایک نئی قسم متعارف ہوئی جس کو عربی میں ''البیع الایجاری'' یعنی وہ اجارہ داری جس کی انتہا بیع پر ہوتی ہے اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بینک کسی کو کچھ سالوں کے لیے گاڑی خرید کر لیز پر دیتا ہے اس کا کرایہ اقساط میں وصول کیا جاتا ہے۔ بینک کرایہ طے کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھتا ہے کہ اس عرصے میں گاڑی کی قیمت مع اتنے نفع کے جو اس عرصے میں بینک کو اس رقم پر سود کی شکل میں حاصل ہونا تھا وصول ہو جاتے ہیں جب گاہک مکمل اقساط ادا کر دیتا ہے تو گاڑی اس کی ملکیت ہو جاتی ہے اس طرح ابتدا میں یہ اجارہ ہوتا ہے جو آخر میں بیع میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس عرصے میں گاڑی کے ہر طرح کے نقصانات کی ذمہ داری گاہک کی ہوتی ہے بعض اہل علم کی رائے میں یہ ایک جدید صورت ہے۔ دین میں اس کے متعلق کوئی ممانعت نہیں ہے اس لیے جائز ہے۔ جب کہ بعض حضرات کے نزدیک یہ ایک عقد میں دو عقد جمع ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔ ہمارا خیال میں اس میں زیادہ قابلِ اعتراض پہلو سود کی آمیزش کا ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ گاہک جب بینک کے پاس گاڑی لینے جاتا ہے تو وہ اس کی قیمت کا کچھ حصہ ڈاؤن پے منٹ (Down Payment) کے نام سے پہلے ادا کرتا ہے جو زیادہ بھی ہوسکتا ہے اور کم بھی لیکن ایک خاص شرح (گاڑی کی قیمت کا دس فیصد) سے کم نہیں ہوتا اب بینک نے کرائے کے نام پر جو اضافی رقم وصول کرنا ہوتی ہے اس کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ ڈاؤن پے منٹ کی رقم کتنی ہے؟ اگر وہ زیادہ ہے تو اضافی رقم زیادہ

وصول کی جائے گی۔اس بارے میں ہم نے مسلم کمرشل بینک کے ایک ذمہ دار سے جو معلومات حاصل کی ہیں ان کے مطابق اگر آپ بینک سے Baleno گاڑی لیتے ہیں اور ڈاؤن پے منٹ پانچ لاکھ ادا کرتے ہیں تو آپ کو پانچ سال کے لیے ۹۷۴۸روپے ماہانہ قسط جمع کروانا ہوگی جو ۵۸۴۴۸۰روپے بنتے ہیں۔اس میں پانچ لاکھ ڈاؤن پے منٹ جمع کر لیں تو مکمل ۱۰۸۴۲۶۰روپے بنیں گے۔اگر آپ ڈاؤن پے منٹ دو لاکھ کرتے ہیں تو آپ پانچ سال تک ۱۶۴۰۸روپے کی ماہانہ قسط جمع کروائیں گے جو ۹۸۴۴۸۰روپے بنتے ہیں۔دو لاکھ ڈاؤن پے منٹ کے نام سے پہلے ادا کیا جا چکا ہے اس طرح کل رقم ۱۱۸۴۴۸۰روپے ہوگی۔پہلی صورت میں ایک لاکھ دو سو روپے کم اور دوسری صورت میں زیادہ کیوں؟ سیدھی سی بات ہے کہ یہ سودی معاملہ ہے پہلی صورت میں بینک کو چونکہ کم پیسے دینے پڑے اس لیے اس کا سود کم اور دوسری صورت میں زیادہ رقم دینا پڑی اس لیے سود بھی زیادہ بنا۔اگر یہ حقیقی اجارہ ہوتا تو یہ فرق نہ ہوتا!! کیونکہ اجارہ میں کرائے کا تعلق حق استعمال سے ہوتا ہے جو دونوں صورتوں میں برابر ہے نہ کہ اس بات سے کہ اس میں بینک کے کتنے پیسے استعمال ہوتے ہیں نیز اگر یہ حقیقی اجارہ ہوتا تو بینک اس کے نقصان کا بھی ذمہ دار ہوتا،اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصل میں یہ سودی معاملہ ہے جسے اجارہ کا نام دیا گیا ہے۔حقیقی اجارہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ:

بظاہر یہ بیع قسط کے مشابہ ہے اس لیے بعض حضرات اسے بیع قسط قرار دے کر اس کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔لیکن درج ذیل وجوہ کے باعث یہ درست نہیں:

- سطور بالا میں ہم نے اس کی جو تفصیل بیان کی ہے اس کے مطابق اسے بیع قسط قرار دینے کی قطعاً گنجائش نہیں۔
- یہ دراصل دو عقد پر مشتمل ہے:

(ا) عقد اجارہ۔ (ب) عقد بیع۔

جب کہ بیع قسط میں صرف ایک عقد ہوتا ہے بیع اور اجارہ الگ الگ اصطلاحات ہیں اور ہر ایک کے احکام بھی مختلف ہیں۔

❁ بیع قسط میں قیمت تو ادھار ہوتی ہے مگر ملکیت فوراً خریدار کے نام منتقل ہو جاتی ہے۔ لیکن یہاں ملکیت تمام اقساط کی ادائیگی کے ساتھ مشروط ہے یہ عقد بیع کے منافی ہے کیونکہ بیع کا اصل مقصد ہی یہی ہے کہ چیز مکمل طور پر فروخت کنندہ کی ملکیت سے نکل کر خریدار کی ملکیت میں آ جائے۔

لیزنگ کا متبادل:

اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ نے اپنے اجلاس جو ۱۰ تا ۱۵ دسمبر ۱۹۸۸ء کو کویت میں منعقد ہوا اس میں مروجہ لیزنگ کے درج ذیل دو متبادل تجویز کیے تھے۔

مدت ختم ہونے کے بعد مستاجر کے پاس تین اختیار ہوں۔

۱۔ گاڑی مالک کے حوالے کر کے عقد اجارہ ختم کر دے۔

۲۔ نئے سرے سے عقد اجارہ کر لے۔

۳۔ گاڑی خرید لے۔

[بحوالہ: بحوث فی الاقتصاد الاسلامی للدکتور علی القراہ الداغی]

اگرچہ اس پر بھی بعض علماء کے تحفظات ہیں مثلاً مدت اجارہ پوری ہونے پر مستاجر تو آزاد ہے مگر مؤجر مستاجر کی پسند کا پابند ہے لیکن یہ اعتراض کوئی زیادہ وزنی نہیں اس لیے یہ صورت شرعی طور پر جائز ہے۔ بشرطیکہ اس کی عملی تطبیق میں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔

مروجہ لیزنگ کا دوسرا متبادل:

اسلامی فقہ اکیڈمی نے اس کی جگہ دوسرا متبادل بیع قسط تجویز کیا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس میں انتقال ملکیت آخری قسط کی ادائیگی کے ساتھ معلق نہ ہو بلکہ دوسری ضمانتیں ہوں۔ [حوالہ مذکورہ]

شیئرز (حصص) کی خرید وفروخت:

دورِ حاضر کے مالی معاملات میں سے ایک شیئرز کی تجارت کا مسئلہ بھی ہے۔ جو فی زمانہ تجارت کی سب سے زیادہ مقبول صورت ہے حتیٰ کے کسی ملک کی اقتصادی ترقی اور تجارتی گہما گہمی کا تعین بھی سٹاک ایکسچینج کے اتار چڑھاؤ سے کیا جاتا ہے، گویا سرمایہ کاری کا رخ بتانے میں اس کی حیثیت بیرومیٹر کی ہے۔

شیئرز کی تاریخ:

چند افراد کا باہم مل کر شراکت کے اصولوں کے مطابق کاروبار کرنا زمانہ قدیم سے رائج ہے۔ عصر حاضر میں اس کو پارٹنر شپ کہا جاتا ہے۔ سترھویں صدی عیسوی میں مشارکت سے ملتی جلتی کاروبار کی ایک نئی شکل سامنے آئی جس کو جوائنٹ سٹاک کمپنی کہا جاتا ہے۔ مشترکہ کاروبار کا یہ ایک نیا تصور تھا جس سے پہلے لوگ شناسا نہیں تھے اس لیے کتب فقہ میں اس کا ذکر بھی نہیں ملتا۔ اس سے پہلے شخصی کاروبار ہوتا تھا یا پھر شراکت ومضاربت کی بنیاد پر۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کی پہلی سٹاک ایکسچینج ایمسٹرڈیم ہالینڈ میں ۱۶۱۱ء میں قائم ہوئی۔ برصغیر میں پہلی سٹاک ایکسچینج اٹھارویں صدی کے آخری نصف میں بمبئی میں قائم ہوئی تھی۔ اس کاروبار میں غیر معمولی وسعت اس وقت پیدا ہوئی جب بیسویں صدی کے آخری نصف میں تجارتی میدان میں اصلاحات کا عمل شروع ہوا اور اس کے نتیجے میں نئی نئی کمپنیاں قائم ہونے لگیں۔ درمیان میں کچھ عرصہ کے لیے اس پر جمود بھی طاری رہا بالخصوص ان ممالک میں جہاں صنعتوں کو قومیانے (Nationalized) کا رجحان غالب تھا۔

شیئرز کی حقیقت:

شیئرز کے لیے اُردو میں حصص اور عربی میں اَسْهُم کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ شیئر کس چیز کی نمائندگی کرتا ہے اس سلسلے میں اہل علم کی مختلف آراء ہیں ایک گروہ کے خیال میں حصص دراصل کمپنی میں شیئر ہولڈرز کے متناسب حصہ کی نمائندگی کا نام ہے اس کی توضیح یوں ہے کہ کمپنی کا کل منظور شدہ سرمایہ مساوی اجزاء میں عام طور پر دس دس روپے میں تقسیم

کر دیا جاتا ہے ہر جزء کو حصہ کہا جاتا ہے۔ جو لوگ حصص خریدتے ہیں وہ اس تناسب سے کمپنی کے حصہ دار ہوتے ہیں اگر کوئی شیئر ہولڈر اپنا حصہ فروخت کرنا چاہے تو وہ سٹاک مارکیٹ میں فروخت بھی کر سکتا ہے۔

دوسرے گروہ کی رائے میں شیئرز محض کمپنی کو دیے ہوئے قرض کا دستاویزی ثبوت ہیں۔ ان حضرات کا استدلال اس بات سے ہے کہ اگر شیئر ہولڈر دیوالیہ ہو جائے تو کمپنی میں اس کے متناسب حصے کی ضبطی نہیں ہوتی جس کی نمائندگی یہ شیئرز کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شیئرز ہولڈر کمپنی کا حصہ دار نہیں ہوتا بلکہ اس نے کمپنی کو قرض دیا ہوتا ہے۔ لیکن دو وجہ سے یہ استدلال درست نہیں۔

- دیوالیہ ہونے کی صورت میں کمپنی میں اس کے حصے کی قرقی نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ کمپنی میں اس کی ملکیت نہیں بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ کمپنی کا اصول ہے کہ کوئی شخص حصہ دار بننے کے بعد کمپنی کی تحویل سے قبل اپنا حصہ نہیں نکلوا سکتا، ہاں! ضرورت کے وقت سٹاک مارکیٹ میں فروخت کر سکتا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کمپنی میں اس کی ملکیت نہیں تھی۔ جس طرح بعض فقہاء کے نزدیک دیوالیہ ہونے کی صورت میں مکان قرق نہیں ہوتا۔ اس کا یہ معنی تو نہیں کہ وہ مکان کا مالک بھی نہیں تھا۔
- اگر کمپنی تحلیل ہو جائے تو اس کے اثاثوں کی تقسیم سے ہر شیئرز ہولڈر کو اس کے حصے کے تناسب سے حصہ ملے گا جس کی مالیت اس کی لگائی ہوئی رقم سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے اور کم بھی۔ اگر ملکیت نہ ہوتی تو حصہ ملنے کا کیا معنی؟

شرعی حکم:

جن حضرات کی رائے میں شیئر کمپنی کو دیئے گئے قرض کی نمائندگی کرتا ہے ان کے نزدیک شیئرز کا کاروبار حرام ہے بعض علماء تو شیئرز کے لین دین کو قمار اور سٹہ بازی بھی قرار دیتے ہیں لیکن گزشتہ سطور میں ہم نے شیئرز کی حقیقت کے متعلق جو تفصیل بیان کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شیئرز کی فروخت درحقیقت کمپنی میں شیئرز ہولڈر کے متناسب حصے کی

فروخت ہے۔ جس کی کمی بیشی کے ساتھ خرید وفروخت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ خواہ ڈیویڈنڈ حاصل کرنے کی نیت ہو یا قیمت بڑھنے کی صورت میں آگے فروخت کرنا مقصود ہو۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ یہ جواز تین پابندیوں کے ساتھ مشروط ہے۔

۱۔ جس کمپنی کے شیئرز خریدے جا رہے ہیں اس کا کاروبار حلال ہو سود میں ملوث نہ ہو۔

۲۔ کمپنی کے اثاثہ جات صرف نقد اور قرضوں کی شکل میں ہی نہ ہوں بلکہ جامد اور مال کی شکل میں بھی ہو۔

۳۔ فروخت اپنی سادہ شکل میں ہو کہ خریدار رقم دے اور فروخت کنندہ حصص اس کے نام منتقل کر دے اگر حصص کے کاروبار کی کسی قسم کا شرعی اصول سے ٹکراؤ ہو تو وہ صورت بلاشبہ ناجائز ہوگی۔

سعودی عرب کے سابق مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ کی سربراہی میں قائم مستقل فتویٰ کمیٹی نے بھی بعض شرطوں کے ساتھ اس کو جائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ ''فتاویٰ اللجنة الدائمة'' میں ہے:

((اذا كانت الاسهم لا تمثل نقودا تمثيلا كليا او غالبا ،وانما تمثل ارضا او سيارات او عمارات ونحو ذلك،وهي معلومة للبائع والمشترى ،جاز بيعها وشراؤها بثمن حال او مؤجل على دفعة او دفعات لعموم أدلة جواز البيع والشراء)) [فتاوىٰ اللجنة الدائمة۔ ج ۱۳، ص ۳۲۱]

''جب شیئرز کلیتاً یا غالب طور پر نقدی کی نمائندگی نہ کر رہے ہوں بلکہ زمین یا گاڑیوں یا عمارات اور اس طرح کی دوسری چیزوں کی نمائندگی کر رہے ہوں اور بائع اور مشتری کو معلوم بھی ہو تو خرید وفروخت کے عمومی دلائل کی بنا پر نقد یا ادھار قیمت پر ان کی خرید وفروخت جائز ہے۔ ادھار کی صورت میں خواہ قیمت ایک ہی قسط میں ادا کی جانی ہو یا متعدد اقساط میں۔

شیئرز کی خرید وفروخت کی بعض ناجائز صورتیں:

ذیل میں حصص کی خرید وفروخت کی ہم دو ایسی صورتیں بیان کرتے ہیں جن پر سٹاک ایکسچینج میں بکثرت عمل ہو رہا ہے مگر وہ شرعی اصول کی مخالفت کی وجہ سے ناجائز ہیں۔

فیوچر سیل:

ایک شخص دوسرے سے یہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ اتنی مقدار یا تعداد میں فلاں چیز مستقبل کی فلاں تاریخ کو اس قیمت پر جو اس وقت واجب الادا ہوگی اس کو ادا کرے گا یا اس وقت اس کی قیمت کی خرید وفروخت میں جو فرق ہوگا وہ ایڈجسٹ کرے گا یہ صورت ناجائز ہے۔ایک تو اس لیے کہ اس میں حصص اور قیمت دونوں ادھار ہیں فروخت کنندہ نے حصص بعد میں دینے ہیں اور خریدار نے قیمت بعد میں ادا کرنی ہے۔

دوسرا اس لیے کہ اس میں چیز کو قبضہ میں لینے سے پہلے فروخت کر دیا جاتا ہے جو کہ شرعاً منع ہے۔بعض حضرات اسے بیع سلم سے قیاس کرتے ہیں جو درست نہیں اس کی تین وجوہ ہیں:

- شیئرز میں بیع سلم نہیں ہو سکتی کیونکہ متعین باغ یا کھیت کی پیداوار میں سلم جائز نہیں جبکہ شیئرز میں کمپنی کا نام ذکر کرنا ضروری ہوتا ہے اس سے اس کی حیثیت متعین چیز میں بیع سلم کی ہو جاتی ہے جو ناجائز ہے۔
- بیع سلم میں چیز کی مکمل قیمت پہلے ادا کرنا ضروری ہے جو یہاں نہیں۔
- بیع سلم میں چیز قبضہ سے قبل فروخت کرنی منع ہے۔لیکن فیوچر سیل میں حوالگی کی تاریخ سے قبل کئی سودے ہو چکے ہوتے ہیں۔

پیشگی فروخت میں اگر صرف فرق برابر کرنا مقصود ہو تو یہ سٹہ بازی ہوگی جو حرام ہے۔

بدلہ (Carey Over):

دو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط سودے جو بیک وقت ہوتے ہیں ایک فریق اپنی موجودہ حیثیت (Position) یعنی وہ خریدے ہوئے حصص جو ابھی فروخت نہیں کیے گئے

حالیہ ادائیگی سے اگلی ادائیگی میں منتقل کر رہا ہوتا ہے اور اس کے لیے وہ کچھ اضافی رقم ادا کرتا ہے۔ اسے عام زبان میں بدلہ کہا جاتا ہے۔ جس کا معنی ہے ادائیگی کا دن بدل جانا۔ اسے سادہ الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایک آدمی نے حصص تو خرید لیے لیکن اس کے پاس ادائیگی کے لیے رقم نہیں وہ یہ چاہتا ہے کہ میری یہ حیثیت آئندہ ادائیگی میں منتقل ہو جائے دوسرا آدمی اس شرط پر وہ حصص خرید لیتا ہے کہ اس نے اگلی ادائیگی میں اضافی رقم لے کر واپس کرنے ہوتے ہیں۔ یہ جائز نہیں کیونکہ یہ سودا واپسی مع اضافہ کے ساتھ مشروط ہے جو جائز نہیں۔
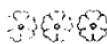
کاروباری دستاویزات

یہ امر واقع ہے کہ نقد یا کرنسی خواہ کتنی ہی مضبوط قوت خرید کی حامل کیوں نہ ہو' تجارتی ضروریات کے مقابلہ میں ناکافی ہوتی ہے۔ چنانچہ تجارتی حلقوں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ایسی دستاویزات متعارف کروائیں ہیں جو کاروباری طبقہ میں نقد کی طرح ہی معتبر سمجھی جاتی ہیں۔ ان کو بینکاری کی اصطلاح میں ''آلات اعتبار'' انگریزی میں Instruments of credit اور عربی میں ''الاوراق التجارية'' کہا جاتا ہے۔ یہ دستاویزات یا آلات اگرچہ اب تجارتی سرگرمیوں کے علاوہ بھی استعمال ہوتی ہیں لیکن اصل میں ان کا اجراء کاروباری حضرات نے اپنی سہولت کی خاطر کیا تھا اس لیے ان کو ''الاوراق التجاریۃ'' (کمرشل پیپرز) کا نام دیا جاتا ہے۔

کاروباری دستاویزات سے مراد:

جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ ان دستاویزات کے لیے آلات اعتبار کی اصطلاح وضع ہے ماہرین آلہ اعتبار کی تعریف یوں کرتے ہیں:

ایسی دستاویزات جو کاروباری لین دین میں زر کا نعم البدل ہوں اور مستقبل کی ادائیگی کے لیے استعمال ہوتی ہوں آلات اعتبار کہلاتی ہیں۔ جیسے چیک' ہنڈی اور تحریری وعدہ وغیرہ۔ [اصول بنکاری: ص ۳۳۸ از قاضی احتشام]

عربی میں ان کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے:

((الاوراق التجارية صكوك ثابتة للتداول تمثل حقا نقديا و تستحق الدفع بمجرد الاطلاع او بعد اجل قصير ويجرى العرف على قبولها كاداة للوفاء)) [البنوك الاسلامية بين النظرية والتطبيق: ص ١٣٤ للدكتور محمد بن عبد الله الطيار]

''کمرشل پیپرز سے باہمی لین دین کی وہ دستاویزی ثبوت مراد ہیں جو نقدی حق کی نمائندگی کرتے ہیں اور نوٹس موصول ہوتے ہی یا مختصر مدت بعد واجب الادا ہوتے ہیں عرف ان کو ایک آلہ ادائیگی کے طور پر قبول کرتا ہے۔''

چونکہ ان دستاویزات کے حقوق کسی دوسرے شخص کو بھی منتقل کیے جاسکتے ہیں اس لیے ان کو (Negotiable instruments) یعنی تحویل پذیر دستاویزات یا تحویل پذیر آلات اعتبار کہا جاتا ہے۔

ان کی تین بڑی قسمیں ہیں:

۱۔ ہنڈی عربی میں ''الکمبالیة'' انگلش میں (Bill of exchange)۔

۲۔ پرومزری نوٹ عربی میں ''السند الاذنی''۔

۳۔ چیک۔

اوراق تجاریہ کی تاریخ ابتداء:

ان کی شروعات کے بارہ میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے کیونکہ اس میں کافی اختلاف ہے۔بعض محققین کی رائے میں ان کے موجد اہل یونان ہیں۔بعض ان کا تعلق حمورابی کے دور سے جوڑتے ہیں بعض کے نزدیک یہ اہل چین جبکہ بعض دوسرے حضرات کے خیال میں اہل فارس کی ایجاد ہے۔لیکن یہ سب آراء دلائل کی تائید سے محروم ہیں اس لیے حقیقت یہی ہے کہ ان کا ابتدائی دور متعین کرنا مشکل ہے تاہم اس اختلاف کے باوجود اکثر محققین کی رائے میں ایک بات یقینی ہے کہ ان کا استعمال بارھویں صدی عیسوی میں عام ہو گیا تھا۔کیونکہ اس صدی کے آغاز میں نقدی کی نقل وحرکت کو محفوظ بنانے کے لیے ہنڈی ایک ذریعہ کے طور پر استعمال ہونا شروع ہوگئی تھی اور کچھ عرصہ بعد ادائیگی کے لیے اور ایک ہی شہر کے اندر بھی استعمال ہونا شروع ہوگئی۔پرومزری نوٹ کا سترھویں صدی عیسوی میں ہوا۔اسی صدی کے آخر ۱۶۹۴ء میں انگلینڈ بینک کے قیام کے بعد چیک کا استعمال شروع ہوا۔[احکام الاوراق التجاریةفی فقه الاسلامی ،ص: ۲۲،۲۳ الدکتور سعد بن الترکی]

کاروباری دستاویزات اور کاغذی کرنسی میں فرق:

اگرچہ تجارتی حلقوں میں یہ دستاویزات کرنسی کی طرح ہی معتبر سمجھی جاتی ہیں یہاں تک کہ بعض نے ان کو مجازی طور پر کرنسی بھی کہا ہے لیکن ان دونوں میں کئی اعتبار سے فرق ہے۔ مثلاً:

- قرض کی ادائیگی میں پیپر کرنسی کو قبول کرنا ضروری ہوتا ہے صاحب حق انکار نہیں کرسکتا جب کہ کمرشل پیپرز میں یہ پابندی نہیں ہوتی اگر وہ انکار کردے تو اس پر جبر نہیں کیا جاسکتا۔
- اگر صاحب حق ہنڈی میں درج رقم میعاد سے قبل وصول کرنا چاہے تو کٹوتی ہوتی ہے کرنسی میں یہ نہیں ہوتا۔
- کمرشل پیپرز میں مدت متعین ہوتی ہے جب کہ کرنسی غیر معینہ عرصہ کے لیے ہوتی ہے بشرطیکہ حکومت رائج کرنسی ختم کر کے نئی جاری نہ کردے۔
- کاغذی کرنسی حکومت یا اس کی زیر نگرانی کوئی ادارہ ہی جاری کرسکتا ہے مگر کاروباری دستاویزات مختلف افراد اور ادارے بھی جاری کرتے ہیں۔
- کاروباری دستاویزات کے حقوق دوسرے کے نام منتقل کرتے وقت تظہیر (پشت پر دستخط) کی ضرورت ہوتی ہے۔ کرنسی اس کی محتاج نہیں ہوتی۔ ملاحظہ ہو: ابحاث ھیئة کبار العلماء بالمملكة العربية السعو دية:۵/۳۲۵. احکام اوراق التجارية في الفقه الاسلامی ، ص: ۴۰. ۵۹ لد کتور سعد بن الترکی۔

کمرشل اور فنانشل پیپرز کا باہمی فرق:

فنانشل پیپرز کو عربی میں "الاوراق المالية" کہتے ہیں ان سے مراد کمپنیوں کے شیئرز اور بانڈز (کمپنی حصول قرض کے لے جاری کرتی ہے) ہیں چنانچہ ڈاکٹر رفیق یونس مصری لکھتے ہیں:

((الاوراق المالية هي الاسهم والسندات))[المصارف الاسلامية: ص: ٤٨]

''اوراق مالیہ (فنانشل پیپرز) سے مراد شیئرز اور بانڈز ہیں۔''

ڈاکٹر احمد بن الخلیل کہتے ہیں اوراق مالیہ کی دو قسمیں ہیں:

(۱) شیئرز (۲) بانڈز

مزید لکھتے ہیں:

''کمرشل پیپرز فنانشل پیپرز سے مختلف ہیں اور دونوں کے حاملین کے حقوق بھی الگ الگ ہیں کمرشل پیپرز کا مقصد مالی حقوق کی حفاظت اور دیون (Debt) ادا کرنا ہے جب کہ فنانشل پیپرز کا مقصد منافع کا حصول اور کمپنی میں دوسرے حقوق حاصل کرنا ہے۔''

[الاسهم والسندات واحكامها في الفقه الاسلامي: ص ٣٢، ٣٣]

ان دونوں کے باہمی فرق کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

- کمرشل پیپرز عام طور پر دیون کی نمائندگی کرتے ہیں جو نوٹس موصول ہونے پر یا مختصر مدت بعد واجب الادا ہوتے ہیں۔ جب کہ فنانشل پیپرز سرمایہ کاری قرض کی رسید ہوتے ہیں۔
- فنانشل پیپرز کے حاملین کمپنی کے منافع میں حصہ دار ہوتے ہیں جب کہ کمرشل پیپرز میں کوئی اضافی فائدہ نہیں ہوتا۔
- کمرشل پیپرز ہر وہ شخص جاری کرسکتا ہے جو ان کے اجراء کا اہل ہو لیکن فنانشل پیپرز صرف مالیاتی ادارے اور کمپنیاں ہی جاری کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی لحاظ سے فرق ہے۔ تفصیل کے لے ملاحظہ ہوں: احكام الاوراق التجارية في الفقه الاسلامي ص: ٦١، ٦٢ سعد بن التركي۔

کمرشل پیپرز کی مختلف قسمیں اور ان میں باہمی فرق:

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ کمرشل پیپرز کی تین بڑی قسمیں ہنڈی، پرومزری نوٹ اور

چیک ہیں۔اب یہاں ہر ایک کا مفہوم اور ان کا باہمی فرق واضح کیا جاتا ہے۔

ہنڈی:

ایک ایسی دستاویز ہے جس میں فروخت کرنے والا یا قرض خواہ خریدار یا مقروض کو حکم دیتا ہے کہ وہ ایک مخصوص رقم معینہ عرصہ بعد اسے یا جس کو وہ کہے ادا کردے۔ [اصول بنکاری، ص:۲۲۵، ۲۲۶ از قاضی احتشام]

اس کی توضیح یوں ہے کہ ''الف'' ''ب'' کو مثلاً ایک لاکھ کا سامان بیچتا ہے۔''ب'' نقد ادائیگی کرنے کی بجائے ایک مہینہ کی مہلت مانگتا ہے اب ''الف'' مال روانہ کرنے کے ساتھ تحریر شدہ ہنڈی بھی ارسال کرے گا۔''ب'' ہنڈی پر قبول ہے کے الفاظ لکھ کر اور اپنے دستخط کر کے واپس ''الف'' کو بھیج دے گا۔قبولیت اور دستخط کے بغیر ہنڈی کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔طے شدہ میعاد گزرنے پر ''الف'' ''ب'' کو ہنڈی پیش کر کے اپنی رقم وصول کرلے گا۔عام طور پر فروخت کنندہ یہ کام خود کرنے کی بجائے بینک کی خدمات حاصل کرتا ہے۔چنانچہ وہ ہنڈی بینک میں جمع کرواتا ہے بینک اس کی میعاد ختم ہونے سے کچھ دن پہلے خریدار کو نوٹس بھیجتا ہے۔پھر طے شدہ مدت پوری ہونے پر رقم وصول کر کے فروخت کنندہ کے کھاتے میں جمع کر دیتا ہے۔بینک اس خدمت کا معاوضہ لیتا ہے۔اگر فروخت کنندہ کو رقم کی فوری ضرورت ہو تو وہ اس کی پشت پر دستخط کر کے اس کے حقوق بینک یا کسی تیسرے شخص کے نام بھی منتقل کر کے اس سے رقم وصول پا سکتا ہے بینک یا وہ شخص اس پر تحریر شدہ رقم میں ایک خاص شرح کے مطابق بالعموم مروجہ شرح سود کے مساوی کٹوتی بھی کرتا ہے۔میعاد پوری ہونے پر بینک یا تیسرا شخص وہ رقم ہنڈی جاری کرنے والے سے وصول پا لیتا ہے۔اس کٹوتی کو بٹہ لگانا کہا جاتا ہے(عربی میں'' خصم الكمبيالة ''انگریزی میں (Discount bil of Exchange)پشت پر دستخط کرنے کو تظہیر (Endorsment) کہتے ہیں۔

پرومزری نوٹ:

جس میں مقروض اپنے قرض خواہ یا خریدار اپنے فروخت کار کو ایک مقررہ رقم عند الطلب یا ایک خاص عرصے بعد ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔[اصول بنکاری:ص۲۴۱]

ہنڈی میں تین فریق ہوتے ہیں:

۱۔ مرتب کنندہ(الساحب Drawer):

اس سے مراد وہ شخص ہے جو ہنڈی لکھتا ہے اور اس نے دوسرے شخص سے قرض لینا ہوتا ہے۔

۲۔ مرتب الیہ(المسحوب علیہ Drawee):

اس سے مراد وہ شخص ہے جو مقروض ہوتا ہے اس کے نام ہنڈی تحریر کی جاتی ہے اور وہ ہنڈی پر دستخط کر کے اس کو قبول کرتا ہے۔

۳۔ وصول کنندہ(المستفید Payee):

یعنی وہ شخص ہنڈی کی رقم وصول پاتا ہے یہ مرتب کنندہ خود بھی ہوسکتا ہے یا وہ شخص جس کے پاس ہنڈی موجود ہو ۔[اصول بنکاری:ص:۲۲۵۔۲۲۶]

پرومزری نوٹ میں صرف دو فریق ہوتے ہیں:

۱۔ مرتب کنندہ: یہ وہ شخص ہوتا ہے جس نے قرض لیا یا ادھار مال خرید رکھا ہو۔

۲۔ وصول کنندہ: وہ شخص جس نے تحریری وعدہ کی رقم وصول کرنی ہو اور یہ عموماً قرض خواہ ہوتا ہے۔[اصول بنکاری:ص:۲۴۱]

چیک:

یہ کھاتہ دار کی طرف سے بینک کے نام ایک غیر مشروط حکم نامہ ہے جس میں وہ بینک کو ہدایت دیتا ہے کہ وہ چیک پر درج شدہ رقم اس یا کسی مخصوص شخص یا حامل چیک کو ادا کرے دوسرے لفظوں میں چیک ایک ایسی دستاویز ہے جو بینک سے رقم نکلوانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔[اصول بنکاری:ص:۱۹۵]

اس میں مرتب کنندہ (الساحب) کھاتہ دار ہوتا ہے اور مرتب الیہ (المسحوب علیه) وہ بینک جس کے نام چیک جاری کیا جاتا ہے جب کہ وصول کنندہ (المستفید) وہ شخص ہوتا ہے جو بینک سے رقم وصول پاتا ہے وہ چیک جاری کرنے والا خود بھی ہوسکتا ہے اور کوئی دوسرا بھی۔ علاوہ ازیں چیک جاری کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ اس پر زیادہ سے زیادہ اتنی ہی رقم درج کی جائے جتنی کھاتے میں موجود ہو۔ اس سے تینوں کا باہمی فرق بھی واضح ہوگیا ہے۔ تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

شرعی حکم:

ان دستاویزات کے متعلق تین امور خاص طور پر تنقیح طلب ہیں۔

۱۔ باہمی لین دین کے وقت ان کو لکھنے کا حکم۔

۲۔ بینک کے ذریعے ان کی وصولی اور اس پر بینک کے معاوضے کی شرعی حیثیت۔

۳۔ میعاد پوری ہونے سے قبل ہنڈی پر بٹہ لگانے کا حکم۔

ذیل میں بالترتیب ان کے جوابات ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ لین دین کے وقت ان کی تحریر میں شرعاً کوئی امر مانع نہیں بلکہ بعض حالات میں تحریر شریعت کا تقاضا ہے جیسا کہ پرومزری نوٹ کا معاملہ ہے۔ یہ اصل میں دَین (Debt) کی دستاویز ہے جس کو لکھنے کا حکم قرآن نے دیا ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاكْتُبُوْهُ﴾

[البقرة: ۲۸۲]

''اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک مقررہ وقت تک ادھار کے ساتھ معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔''

ڈاکٹر علامہ عمر بن عبدالعزیز المترک رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((فانه لا محذور شرعا فی تحریر هذه الاوراق لانها اما وثيقة بدين كما فی السند الاذنی وتحريرها مطلوب شرعا للاستيثاق قال

تعالى: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ﴾[البقرة: ۲۸۲] واما حوالة كما فى الكمبالية، واما حوالة و وكالة كمافى الشيك، فالآمر فيه مودع والمصرف مدين والشخص الثالث اما محال على مدين او موكل فى الاستيفاء لحقه وهذامشروع فى الجملة))

''ان دستاویزات کی تحریر میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ یہ یا تو قرض کی دستاویزات ہیں جیسا کہ پرومزری نوٹ ہے اطمینان کے لیے شرعاً اس کی تحریر کا مطالبہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک مقررہ وقت تک ادھار کے ساتھ معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔﴾ یا حوالہ[*] ہے جیسا کہ ہنڈی ہے۔ یا حوالہ اور وکالہ ہے جیسا کہ چیک ہے اس میں حکم دینے والا ڈیپازٹر ہوتا ہے اور بینک کی حیثیت مقروض کی ہے۔ اور تیسرے شخص کی حیثیت یا تو محال یا حق کی وصولی کے لے وکیل کی ہے اور یہ سب جائز ہیں۔''

البتہ جن صورتوں میں دونوں طرف سے نقد ہونا شرط ہے جیسے بیع صرف یعنی روپے کا ڈالر وغیرہ سے تبادلہ یا ایک طرف سے مجلس عقد میں مکمل ادائیگی ضروری ہو

---

[*] ''حوالہ شریعت کی ایک معروف اصطلاح ہے جس کا معنی ہے ''نقل دين من ذمة الىٰ ذمة'' قرض کی ذمہ داری ایک شخص سے دوسرے کی طرف منتقل کرنا۔'' [فتح الباری: ٤/ ٥٨٥]

''یعنی مقروض خود قرض ادا کرنے کی بجائے قرض خواہ کو کسی دوسرے کے سپرد کر دے کہ اس سے وصول کر لینا''

''اکثر کے نزدیک حوالہ صحیح ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس کے حوالے کیا جا رہا ہو وہ اس پر رضا مند ہو۔'' [فتح الباری: ٤/ ٥٨٥]

''اسی طرح حوالہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ جس کے حوالے کیا جا رہا ہے اس کے ذمہ حوالہ کرنے والا کا اتنا قرض ضرور ہو جتنا اس کے ذمہ اس شخص کا ہے جس کو یہ حوالے کر رہا ہے۔ واضح رہے ہنڈی صرف ایک صورت میں حوالہ بنتی ہے وہ ہے جب ہنڈی کے وصول کنندہ نے مرتب کنندہ کو قرض دے رکھا ہو اور مرتب کنندہ اسے مرتب الیہ کے حوالے کرے کہ آپ اس سے وصول پا لیں۔''

جیسے بیع سلم[1] ہے۔ وہاں ہنڈی کا استعمال درست نہیں۔

بینک کی وساطت سے وصولی کا حکم:

ان کی وصولی میں بینک کی خدمات حاصل کرنے اور اس کے بدلے بینک کو کمیشن دینے میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں بینک وصول کنندہ کا وکیل ہوتا ہے۔

چنانچہ علامہ ڈاکٹر عمر بن عبدالعزیز المترک رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((هذه العملية ظاهر فيها الجواز شرعا لان العمولة التى يا خذها المصرف هى اجرة او جعالة له على التحصيل و ما يتطلبه من جهد و يتكلفه من مصاريف انتقال محصيله و ارسال الاخطارات لهم و الاشعارات بسدادهم))[الربا و المعاملات المصرفية:ص٣٩٥]

''یہ کارروائی بظاہر شرعی طور پر جائز ہے کیونکہ بینک جو کمیشن لیتا ہے وہ وصولی کی خدمات سرانجام دینے کی اجرت یا حق محنت ہے۔ علاوہ ازیں وصولی کی کارروائی اور ادائیگی کے نوٹس وغیرہ بھیجنے پر اخراجات بھی آتے ہیں۔''

لہٰذا بینک کو اپنی خدمت کی اجرت اور اخراجات وصول کرنے کا حق ہے۔

ڈاکٹر علی احمد السالوس حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

((و البنك يتعامل فى هذه الاوراق من حيث الحفظ' و التحصيل لحساب المستفيد كوكيل عنه الوكالة هنا باجر' و العمولة التى يأخذ البنك يقابلها منفعة مشروعة' و خدمة تؤدى هذا من الاعمال المصرفية الجائزة شرعا و مايؤخذ فى نظيرها ليس من الربا))

[المعاملات المالية المعاصرة :ص:١٢٤]

''ان اوراق میں بینک کا کردار یہ ہے کہ وہ ان کی حفاظت کرتا ہے اور وصول کنندہ کے

---

[1] بیع سلم کا مفہوم یہ ہے کہ چیز کی قیمت پیشگی ادا کر دی جائے لیکن چیز بعد میں وصول پائی جائے اس میں مکمل قیمت پیشگی ادا کرنا لازمی شرط ہے۔''

وکیل کی حیثیت سے وصول کرکے اس کے کھاتے میں جمع کرواتا ہے بینک کی یہ وکالت اجرت کے بدلے ہوتی ہے۔ چنانچہ بینک جو کمیشن لیتا ہے وہ ایک جائز فائدے اور خدمت کا بدلہ ہے بینکاری امور میں یہ عمل شرعاً جائز ہے۔ اس کے مقابلے میں جو کمیشن لیا جاتا ہے وہ سود نہیں۔"

ایک شبہ کا ازالہ:

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بینک وکیل ہے تو مال بینک کے پاس ضائع ہونے کی صورت میں بینک پر کوئی تاوان نہیں ہونا چاہیے بشرطیکہ اس کی کوتاہی یا غفلت شامل نہ ہو لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے کہ بینک ہر صورت میں ضامن ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بینک اجیر مشترک ہے جو متعدد لوگوں کی وکالت کا فرض سرانجام دیتا ہے اور مشترک نقصان کی صورت میں ذمہ دار ہوتا ہے۔ شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

شریعت میں اجیر (کارکن) دو قسم کے ہیں:

۱۔ اجیر خاص۔

۲۔ اجیر مشترک۔

مثلاً کسی نے ایک دھوبی خاص اپنے لیے نوکر رکھا ہوا ہے اور دوسری قسم یہ ہے کہ دھوبی بہت سے لوگوں کے کپڑے دھوتا ہے۔ قسم اول سے کوئی نقصان اس کی لاپروائی یا بددیانتی کے بغیر ہو جائے تو اس پر تاوان نہیں ہوتا قسم دوم پر ہوتا ہے۔ [فتاوی ثنائیہ: ٢/ ٤٤٦]

ہنڈی بھنانے کا حکم:

جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ ہنڈی بھناتے وقت بینک ایک خاص شرح کے مطابق کٹوتی بھی کرتا ہے جب کہ کمیشن اور ڈاک اخراجات اس کے علاوہ ہوتے ہیں۔ یہ کٹوتی اصل میں وہ سود ہوتا ہے جو بینک کو اس عرصہ میں اس رقم کے عوض حاصل ہونا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بٹہ لگانے کی شرح ہنڈی کی تاریخ ادائیگی کو سامنے رکھ کر مقرر کی جاتی ہے جوں جوں تاریخ ادائیگی قریب آتی جاتی ہے یہ شرح کم ہوتی جاتی ہے۔ جب اس کا سود ہونا

ثابت ہوگیا تو اس کے حرام ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں رہتا۔

چنانچہ ڈاکٹر علی احمد السالوس حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

((واسوأ اعمال البنك هنا اتخاذه الاوراق التجارية وسيلة للاقراض الربوى و ذلك عن طريق ما يسمى بالخصم))

[المعاملات المالية المعاصرة 'ص:١٢٤]

''یہاں بینک کا بدترین کردار کاروباری دستاویزات کو سودی قرض کا ذریعہ بنانا ہے اور یہ ڈسکاؤنٹ کی صورت میں ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر وہبہ زحیلی حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

((وهذه العملية حرام شرعا لانها قرض الربوى يتضمن فائدة ربوية عن المدة المستقبلية و يدخل تحت مفهوم ربا النساء المحرم شرعا لان البنك يدفع الاقل ليقبض فى نظيره اكثر منه بعد اجل وهو امر محظور شرعا باتفاق الفقهاء لوجود الربا فيه)) [المعاملات المالية المعاصرة 'ص:٢٣٣]

''یہ عمل شرعی طور پر حرام ہے کیونکہ یہ سودی قرض ہے جو مستقبل کے عوض سودی فائدے پر مشتمل ہے یہ ربا النسیئۃ کے مفہوم میں داخل ہے جو شرعا حرام ہے۔ کیونکہ بینک نے کم رقم دے کر کچھ مدت بعد اس کے عوض زیادہ حاصل کرنی ہے اس میں ربا کی آمیزش ہونے کی وجہ سے فقہاء شرعی طور پر اس کے حرام ہونے پر متفق ہیں''۔

اسلامی فقہ اکیڈمی نے بھی ایک قرار داد (بمطابق ۱۹۹۲ء) میں اسے حرام قرار دیا ہے۔ [حوالہ مذکورہ]

بعض شبہات کا ازالہ:

بعض حضرات یہ توجیہ کرتے ہیں کہ بینک اصل میں ہنڈی کے وصول کنندہ کا وکیل ہوتا ہے جس نے ہنڈی کے مرتب الیہ سے رقم وصول پا کر اس کے سپرد کرنا ہوتی ہے۔

ڈسکاؤنٹ کے بعد بینک جو رقم دے رہا ہے وہ اصل میں بینک کی طرف سے وصول کنندہ کی خدمت میں قرض ہے جو اس نے ہنڈی کی وصولی پر واپس کرنا ہوتا ہے جب کہ ڈسکاؤنٹ کی رقم بینک کا حق محنت ہے یوں یہ دو مختلف معاملات بن جاتے ہیں۔

۱۔ ہنڈی کے وصول کنندہ کا بینک کو اجرت پر وکیل مقرر کرنا۔

۲۔ بینک کا ہنڈی پر تحریر شدہ رقم کے مساوی قرضہ فراہم کرنا اور وصول کنندہ کا بینک کو وصول ہونے والی رقم سے اپنا قرض واپس لینے کا اختیار دینا۔

شرعی طور پر یہ دونوں معاملے جائز ہیں۔اجرت پر وکیل بنانا بھی اور مشروط اضافہ کے بغیر قرض دینا بھی۔ یوں اس میں کوئی خرابی نہیں رہتی۔

جواب:

بظاہر یہ توجیہ بڑی دلکش معلوم ہوتی ہے لیکن اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو اس کی کمزوری بالکل عیاں ہے۔

❁ ایک تو اس لیے کہ بینک جو کٹوتی کرتا ہے وہ ادائیگی کی مدت سے وابستہ ہوتی ہے اگر وہ زیادہ ہوگی تو کٹوتی کی شرح بھی زیادہ۔اور اگر وہ مدت کم ہوگی تو کٹوتی کی شرح بھی کم جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔اگر یہ حق محنت ہے تو دونوں صورتوں میں فرق کیوں؟ جب کہ حق محنت دونوں صورتوں میں برابر ہے کٹوتی کو ادائیگی کی مدت سے وابستہ کرنا اس کے سود ہونے کی بین دلیل ہے۔

❁ دوسرا اس لیے کہ بینک جو کٹوتی کرتا ہے وہ ادائیگی کی تاریخ آنے سے پہلے ہوتی ہے اس کا مطلب ہے کہ بینک نے ابھی تک کوئی خدمت سرانجام نہیں دی لیکن حق محنت وصول کر لیا ہے حالانکہ حق محنت کام پورا ہونے کے بعد دیا جاتا ہے۔

❁ تیسرا اس لیے کہ یہ قرض وکالت کے معاوضہ کی صورت میں اضافی فائدہ کا باعث بن رہا ہے اور جس قرض سے فائدہ حاصل ہو وہ سود کے زمرے میں آتا ہے۔

چنانچہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن

عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((انهم نهوا عن قرض جرّ منفعة))[ارواء الغليل :٥/٢٣٤]

''انہوں نے اس قرض سے منع کیا جو فائدے کا باعث بن رہا ہو''

دوسرا شبہ:

دوسری توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ حامل دستاویز اصل میں بینک کو وہ دستاویز کم قیمت پر فروخت کرتا ہے یعنی جب ہزار کی ہنڈی کے بدلے ۹۵۰ وصول پاتا ہے تو گویا ایک ہزار کو ۹۵۰ کے عوض فروخت کیا اور یہ جائز ہے۔

جواب:

یہ صورت ''بيع الدين على غير من هو عليه '' ''اس شخص کے ساتھ دَین (قرض) کی بیع ہے جس پر دین نہیں ہے'' کہلاتی ہے۔ اگر چہ بعض فقہاء نے اس کو جائز قرار دیا ہے لیکن اس سے ہنڈی کے ڈسکاؤنٹ کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں سود کی دونوں قسمیں ربا الفضل اور ربا النسيئة پائی جاتی ہیں۔ وہ اس طرح کہ یہاں در حقیقت نقد کی نقد ساتھ بیع ہے جس میں کمی بیشی اور ادھار دونوں سود شمار ہوتے ہیں جب کہ یہاں دونوں چیزیں ہی پائی جارہی ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ جائز نہیں۔

تیسرا شبہ:

بعض حضرات کے خیال میں اگر مرتب الیہ بٹہ لگانے والا بینک خود ہو تو اس کا مطلب ہوگا کہ قرض کی جلد ادائیگی کے بدلے اس کا کچھ حصہ چھوڑا جا رہا ہے۔ جیسا کہ سعودی کبار علماء کے بورڈ کی رائے ہے۔[ابحاث هيئة كبار العلماء :٥/٣٧٨]

اس کو اصطلاح میں ضَعُ وَتَعَجَّلُ ''چھوڑ دو اور جلد وصول کر لو'' کہا جاتا ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حضرت ابراہیم نخعی اور امام ابوثور رحمہ اللہ کے نزدیک بھی یہ جائز ہے۔[مصنف عبدالرزاق :باب الرجل يضع من حقه و يتعجل ،المغنى :٦/١٠٩]

حضرت عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب اور شیخ عبدالرحمٰن سعدی رحمہ اللہ بھی اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔[ابحاث هيئة كبار العلماء :٥/٣٧٩]

علامہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ [الربا والمعاملات المصرفية: ص:٣٩٢]

جواب:

لیکن درج ذیل وجوہ کے باعث یہ رائے درست معلوم نہیں ہوتی۔

❁ ان حضرات کے برعکس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین عظام اور فقہاء محدثین کی غالب اکثریت ضع وتعجل کو ناجائز سمجھتی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((كرهه زيد بن ثابت ، وابن عمر ، والمقداد ، سعيد بن المسيب ، سالم ، والحسن ، و حماد ، والحكم ، والشافعي ، ومالك، والثوري ، وهشيم ، وابن علية، واسحاق ، وابو حنيفة))

[المغنی:٤/١٠٩]

''حضرت زید بن ثابت، عبداللہ بن عمر، مقداد، سعید بن میسب، سالم، حسن، حماد، حکم، شافعی، مالک، ثوری، ہشیم، ابن علیہ، اسحٰق، ابوحنیفہ رحمہ اللہ اس کو مکروہ سمجھتے ہیں۔''

ابوصالح رحمہ اللہ کہتے ہیں:

((بِعْتُ بَزًّا لِي مِنْ أَهْلِ دَارِ نَخْلَةَ إِلَى أَجَلٍ ثُمَّ أَرَدْتُ الْخُرُوجَ إِلَى الْكُوفَةِ فَعَرَضُوا عَلَيَّ أَنْ أَضَعَ عَنْهُمْ بَعْضَ الثَّمَنِ وَيَنْقُدُونِي فَسَأَلْتُ عَنْ ذَلِكَ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ فَقَالَ لَا آمُرُكَ أَنْ تَأْكُلَ هَذَا وَلَا تُوكِلَهُ))

[موطا: كتاب البيوع،باب ماجاء فى الربا فى الدين]

''میں نے اہل نخلہ کو ادھار کپڑا فروخت کیا پھر میرا کوفہ جانے کا ارادہ بن گیا انہوں نے مجھے یہ پیشکش کی کہ میں کچھ قیمت کم کر دوں تو وہ باقی قیمت فوری ادا کر دیں گے۔ چنانچہ میں نے اس کے متعلق زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا

میں آپ کو یہ مشورہ نہیں دیتا کہ آپ اس کو کھائیں یا دوسرے کو کھلائیں۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا:

((عَنِ الرَّجُلِ يَكُونُ لَهُ الدَّيْنُ عَلَى الرَّجُلِ إِلَى أَجَلٍ فَيَضَعُ عَنْهُ صَاحِبُ الْحَقِّ وَيُعَجِّلُهُ الْآخَرُ فَكَرِهَ ذَلِكَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ وَنَهَى عَنْهُ))[مؤطا امام مالك :باب ما جاء في الربا في الدين]

"ایک آدمی نے دوسرے سے ایک عرصہ بعد قرض لینا ہے۔صاحب حق کچھ چھوڑ دیتا ہے اور دوسرا جلد ادا کر دیتا ہے تو انہوں نے اس کو ناپسند فرمایا اور اس سے منع فرمایا۔"

حضرت معمر رحمہ اللہ کہتے ہیں:

((ولا أعلم أحدا قبلنا إلا وهو يكرهه)) [مصنف عبدالرزاق:باب الرجل يضع من حقه و يتعجل]

"ہم سے پہلے تمام لوگ اس کو مکروہ سمجھتے تھے۔"

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((والامر المكروه الذى لا اختلاف فيه عندنا ان يكون للرجل على الرجل الدين الى اجل فيضع عنه الطالب ويعجله المطلوب ' وذالك عندنا بمنزلة الذى يؤخر دينه بعدمحله عن غريمه ويزيده الغريم فى حقه قال :فهذا الربا بعينه لا شك فيه)) [مؤطا امام مالك: باب ما جاء فى الربا فى الدين]

"وہ معاملہ جو مکروہ ہے جس میں ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں وہ یہ ہے کہ آدمی نے دوسرے سے ادھار لینا ہو تو صاحب حق کچھ چھوڑ دے اور دوسرا جلد ادا کر دے یہ ہمارے نزدیک ایسے ہی ہے جیسے کوئی ادائیگی کی تاریخ آنے کے بعد قرض میں تاخیر کرے اور قرض خواہ اپنے حق میں اضافہ کر دے یہ بلاشبہ مبینہ سود ہے۔"

❁ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہنڈی کی ڈسکاؤنٹ پر"ضع و تعجل" کا اصول منطبق نہیں

ہوتا۔ کیونکہ ''ضع و تعجل '' میں جو رقم چھوڑی جاتی ہے اس کا انحصار قرض خواہ پر ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف ہنڈی میں ڈسکاؤنٹ کی شرح بینک طے کرتا ہے۔

- ''ضع و تعجل ''میں مدت کا خیال نہیں رکھا جاتا جب کہ ڈسکاؤنٹ کی شرح مدت سامنے رکھ کر طے کی جاتی ہے۔ لہذا اس کو ''ضع و تعجل '' کی بنیاد پر جائز قرار دینا درست نہیں۔

حقوق کی بیع

حق تالیف، حق ایجاد، رجسٹرڈ تجارتی نام ونشان کی خرید وفروخت اور پگڑی کا لین دین مالی معاملات کی وہ صورتیں ہیں جن کا قرآن وحدیث میں کوئی تذکرہ نہیں ملتا اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام اور ائمہ حدیث وفقہ رحمہم اللہ سے ان کے متعلق کوئی نص مروی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسائل خیر القرون سے کافی عرصہ بعد سامنے آئے۔البتہ جن علماء کے دور میں یہ مسائل پیدا ہوئے انہوں نے کھل کر ان کے بارہ میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ذیل میں ہم ہر ایک کی مختصر تاریخ، مفہوم اور قرآن وحدیث کی اصولی ہدایات کی روشنی میں ان کا شرعی حکم بیان کرتے ہیں۔

حق التالیف:

ہر مؤلف کو اپنی تالیف سے متعلق دو قسم کے حقوق حاصل ہوتے ہیں:

(۱) ادبی (۲) مالی

ادبی کا اطلاق اس غیر مالی اختیار پر ہوتا ہے جس سے مؤلف کو درج ذیل دائمی اور ابدی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

- تالیف صرف اسی طرف منسوب ہوگی، کوئی دوسرا اپنا نام استعمال نہیں کرسکتا حتیٰ کہ خود مؤلف کو بھی یہ اختیار نہیں کہ وہ اپنی فکری کاوش دوسرے کے نام سے شائع کرے کیونکہ یہ جھوٹ کے زمرہ میں آتا ہے۔
- یہ فیصلہ کرنا بھی مؤلف کا اختیار ہوگا کہ کتاب کب شائع کرنی ہے؟ اور طباعت کا معیار کیا ہوگا۔
- دوبارہ اشاعت کی صورت میں حک واضافہ کرنا۔

* اگر کوئی شخص ان ادبی اور مالی حقوق پر ڈاکہ ڈالے تو اس کا دفاع کرنا مؤلف اور اس کے ورثاء کا حق ہے۔
* اشاعت کے بعد اگر مؤلف یہ سمجھے کہ یہ مضمون اس کی آراء کے مطابق نہیں یا اس کی شخصیت کو نقصان پہنچا سکتا ہے تو بازار سے کتاب واپس لینے کی نگرانی کرنا۔ ایسی صورت میں ناشر کے نقصان کی تلافی کرنا مؤلف کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

مالی حق کا مطلب ہے کہ کتاب کی اشاعت، تقسیم یا دوسرے ذرائع مثلاً سی ڈی یا آڈیو کیسٹ کے ذریعے بیان کرنے سے جو فوائد حاصل ہوں گے وہ بھی مؤلف کا حق ہیں۔ بسا اوقات مؤلف یہ حق فروخت بھی کر دیتا ہے۔ یہی فروخت اس وقت ہمارے زیر بحث ہے کہ آیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں۔

حق التالیف کی تاریخ:

اوّل الذکر یعنی ادبی حق تو ہر دور میں معتبر رہا ہے۔ کسی کی فکری کاوش کو اپنی طرف منسوب کرنا ہمیشہ معیوب سمجھا جاتا رہا ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وكحيل اللصوص و السراق على أخذاموال الناس وهم انواع لاتحصى فمنهم السراق بأيديهم ومنهم السراق بأقلامهم))

[اعلام الموقعین: ج ۳ ص ۱۰۷۶]

''حیلوں کے ذریعے لوگوں کا مال چرانے والوں کی بے شمار قسمیں ہیں۔ بعض ہاتھوں سے چوری کرتے ہیں بعض قلموں کے ذریعے لوگوں کا مال چراتے ہیں۔''

علماء نے اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں امام سیوطی رحمہ اللہ کی کتاب ''الفارق بين المصنف والسارق'' بھی شامل ہے۔ مالی حق کی شروعات پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں یورپ سے ہوتی ہے اور یہی زمانہ پریس کی ایجاد کا ہے۔ اس کے حق میں اولین قانون ۱۷۰۹ء۔۱۔۱۱ کو برطانیہ کے لارڈ ہاؤس نے پاس کیا پھر ۱۹۱۰ء۔۱۲۔۱۰ کو ملکہ برطانیہ کے دستخطوں سے فکری کاوشوں کے تحفظ کا قانون جاری ہوا۔

۱۷۹۱ء اور ۱۷۹۳ء کو فرانس میں اس کے حق میں قوانین بنائے گئے۔ ۱۷۸۹ء کو امریکا کی ایک ریاست Massachusetts اور ۱۷۹۰ء میں مرکز کی سطح پر اس کے حق میں قانون سازی ہوئی۔[حقوق الاختراع والتأليف في الفقه الاسلامي ص:٣٣٤]

اسلامی ممالک میں اس کے حق میں پہلی مرتبہ قانون سازی ۱۹۱۰ء میں عہد عثمانی میں ہوئی۔ بین الاقوامی سطح پر اس کے متعلق پہلا معاہدہ سوئٹزرلینڈ کے دارالحکومت برن میں ۱۸۸۶ء میں ہوا۔ بعد میں مختلف کانفرنسوں میں اصلاحات ہوتی رہیں۔ اب تقریبا ہر ملک میں اس حق کو قانونی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

حق ایجاد:

کسی شخص کو نئی چیز ایجاد کرنے کے بدلے جو حقوق حاصل ہوتے ہیں ان کو حقوق ایجاد کہا جاتا ہے۔ جیسے یہ حق کہ

- وہ چیز اس کی ایجاد کردہ کہلائے گی۔ دوسرا شخص نہ تو اس کو اپنی جانب منسوب کرسکتا ہے اور نہ اس کی نقل تیار کرسکتا ہے۔
- اس کے مالی فوائد پر موجد اور پھر متعینہ مدت تک اس کے ورثاء کا حق ہوتا ہے۔

"اس کے حق میں اوّلین قانون ۱۴۷۲ء کو اٹلی میں بنا۔ ۱۶۲۳ء میں انگلینڈ، ۱۷۹۱ء کو فرانس اور ۱۸۱۵ء کو جرمنی کی بعض ریاستوں میں اس کے حق میں قوانین بنائے گئے۔ البتہ پورے جرمنی میں اس کو قانونی تحفظ ۱۸۴۲ء کے بعد ملا۔ اسلامی ممالک میں اس کی تاریخ عثمانی دور سے شروع ہوتی ہے۔" [حقوق الاختراع والتأليف في الفقه الاسلامي]

تجارتی نام اور علامات:

کسی کارخانہ کا وہ مخصوص نام جو اسے الگ شناخت دے اس کا تجارتی نام کہلاتا ہے۔ مصنوعات کی پہچان کے لیے مقرر کردہ مخصوص نشان کو تجارتی علامت (ٹریڈ مارک) کہا جاتا ہے۔ یہ متعلقہ تاجر کا حق شمار ہوتا ہے۔ قانوناً دوسرے کے لیے اس کا استعمال ممنوع

ہوتا ہے۔ متعلقہ تاجر اگر چاہے تو یہ نام فروخت بھی کر سکتا ہے۔ اس کا ابتدائی دور انقلاب فرانس کا نواں (۹) سال ہے جب پیرس کی اپلیٹ کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ جب کوئی شخص دُکان فروخت کرتا ہے تو اس میں مادی ملکیت کے ساتھ ساتھ معنوی ملکیت بھی شامل ہوگی۔

[المعاملات المالية المعاصرة فی الفقه الاسلامی للدکتور محمد عثمان شبیر]

''معنوی'' سے مراد شہرت اور لوگوں کا اعتماد (Good will) ہے۔

معنوی حقوق کی بیع کا شرعی حکم:

ان حقوق کو حقوق معنویہ کہا جاتا ہے یعنی وہ اختیار جن کا تعلق مادی چیز سے نہ ہو ان کی بیع وشراء میں اختلاف ہے۔ علماء کا ایک گروہ اس کے جواز کا فتوی دیتا ہے تو دوسرا عدم جواز کو ترجیح دیتا ہے جب کہ بعض کے نزدیک مؤلف کو یہ حق تو پہنچتا ہے کہ وہ اپنی تالیف یا ایجاد سے مالی فائدہ اٹھائے یا شراکت کی بنیاد پر کسی سرمایہ کار کو اپنے ساتھ شامل کرے لیکن ان حقوق کی بیع درست نہیں۔ ان کا استدلال اس بات سے ہے کہ بیع کا مطلب ہے ہر قسم کے ملکیتی حقوق مشتری کی طرف منتقل ہو جائیں اس طرح کہ وہ چیز اس کی طرف منسوب ہو جائے شرعا یہ جائز نہیں کہ چیز ملکیت کسی اور کی ہو لیکن اس کی نسبت دوسرے کی طرف ہو کیونکہ یہ جھوٹ اور فراڈ ہے۔ اس استدلال کا جواب یہ دیا گیا ہے یہ تب منع ہے جب خریدار ایجاد یا تالیف کی نسبت اپنی طرف منسوب کرے اگر یہ ہو کہ کتاب لکھی تو فلاں نے ہے مگر یہ ملکیت فلاں کی ہے تو اس میں کوئی جھوٹ اور فراڈ نہیں ہے۔

اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ لوگ ہمیشہ سے اپنی کتب وقف اور ہدیہ کرتے رہے ہیں نام مؤلف کا ہی ہوتا تھا۔ متقدمین میں سے کسی نے اس کو ناجائز قرار نہیں دیا۔ [حقوق الاختراع والتالیف فی الفقه الاسلامی]

شیخ بکر بن عبداللہ ابوزید رحمہ اللہ نے قائلین اور مانعین کے دلائل بڑی تفصیل سے بیان فرمائے ہیں ذیل میں ہم ان کے حوالے سے فریقین کے بعض دلائل نقل کرتے ہیں۔

قائلین کے دلائل:

❁ یہ ان حقوق کی طرح ہیں جو انسان کو اپنے بدن، حواس اور جذبات سے متعلق تکوینی اور جبلی تصرفات کے بارہ میں حاصل ہیں۔

❁ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللّٰهِ)) [صحيح بخاري: باب الشَّرْطِ فِي الرُّقْيَةِ بِقَطِيعٍ مِنَ الْغَنَمِ]

''سب سے زیادہ حق دار جس پر تم اجرت لو اللہ کی کتاب ہے''

جب قرآن کا معاوضہ لینا جائز ہے تو دوسری کتب کا بالاولیٰ جائز ہوگا۔

❁ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تعلیم کو حق مہر مقرر کر کے ایک صحابی کا نکاح پڑھایا۔ جب قرآن کی تعلیم مہر بن سکتی ہے تو اس کی نشر و اشاعت کا معاوضہ کیوں نہیں لیا جا سکتا؟

❁ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا۔

((أَيُّ الْكَسْبِ أَطْيَبُ قَالَ عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهِ وَكُلُّ بَيْعٍ مَبْرُوْرٍ))

[مسند احمد: ١٧٧٢٨]

''کون سی کمائی بہتر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انسان کا اپنے ہاتھ سے کمانا اور ہر مبرور بیع۔''

❁ علمائے سلف سے بھی کتب کا معاوضہ لینا ثابت ہے۔ ابو نعیم اصفہانی رحمہ اللہ نے چار (٤٠٠) سو دینار لے کر اپنی کتاب الحلیۃ بیچی۔ یہ چار سو دینار ورق اور لکھنے کی قیمت تو نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح جب مختلف علاقوں کے حکمرانوں نے اپنے علماء کے ذریعے علامہ ابن حجر رحمہ اللہ سے ان کی کتاب کے نسخے منگوائے تو انہوں نے تین سو (٣٠٠) دینار وصول کر کے دیئے۔

❁ کتاب مصنف کی ملکیت ہوتی ہے لہذا اس کو ہر قسم کا اختیار ہے ہبہ کرے یا وقف کرے یا فروخت۔

- حق تالیف حقوق مقررہ میں سے ہے نہ کہ حقوق مجردہ سے۔ کیونکہ حق مجردوہ ہوتا ہے جس کو شارع نے دفع ضرر کے لے مشروع قرار دیا ہو جیسے حق شفعہ۔

حق مقرروہ ہوتا ہے شروع ہی سے حق دار کے لیے ثابت ہو اس قسم کے حق کا معاوضہ لیا جاسکتا ہے۔ حق تالیف اسی قبیل سے ہے۔

مانعین کے دلائل:

جو حضرات ان حقوق کی خرید و فروخت کے مخالف ہیں ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:

- علم عبادت ہے، صنعت و تجارت نہیں اور عبادت کا معاوضہ درست نہیں۔
- اس سے کتمان علم لازم آتا ہے جو حرام ہے
- یہ حق مجرد ہے اور حق مجرد کا معاوضہ صحیح نہیں۔ [فقه النوازل: ج ۲ ص ۱۷۱، ۱۸۳]

راجح رائے:

اگر فریقین کے دلائل کا تجزیہ کیا جائے تو تین وجوہ کے باعث ان لوگوں کی رائے صائب معلوم ہوتی ہے جو اس کے حق میں ہیں:

۱۔ مانعین نے اپنی تائید میں جو دلائل ذکر کیے ہیں وہ اس ثبوت کے لیے کافی وشافی نہیں ہیں مصنف اگر کتاب پر حقوق الطبع محفوظ ہیں لکھ دیتا ہے تو اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہوتا کہ وہ علم چھپانا چاہتا ہے، اس کا مقصد تو صرف ناشر کو اس بات کا پابند بنانا ہوتا ہے کہ وہ تنہا ہی اس سے فائدہ نہ اٹھائے بلکہ مؤلف کا بھی خیال رکھے۔ مانعین کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ یہ طاعت ہے نہ کہ تجارت اس لے اس کا معاوضہ نہیں لیا جاسکتا۔ کیونکہ طاعات کی اجرت کا ثبوت حدیث سے بھی ثابت ہے اور فقہاء سے بھی۔ اس کو حق شفعہ پر بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ حق شفعہ کا مقصد دوسرے کو ضرر سے محفوظ رکھنا ہے جب کوئی یہ حق فروخت کرتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ دوسرے کو بیچنے سے اس کا کوئی نقصان نہیں۔ لہذا اس کا معاوضہ لینا جائز نہیں۔ جب کہ زیر بحث حق دفع ضرر کے لیے نہیں بلکہ فکری و عملی محنت کا عوض ہے۔

۲۔ جمہور فقہاء کے نزدیک مال کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جس سے عام حالات میں فائدہ اٹھایا جائے، اس حق کے قابل انتفاع ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

۳۔ ٹریڈ مارک اور تجارتی نام رجسٹرڈ کروانے میں محنت کے علاوہ اچھا خاصا سرمایہ بھی خرچ کیا جاتا ہے اس لے ان کو فروخت کرنا جائز ہے۔ اسلامی فقہ اکیڈمی نے اپنے پانچویں اجلاس جو دس سے پندرہ دسمبر ۱۹۸۸ء کو کویت میں منعقد ہوا نے بھی اس کے حق میں رائے دی ہے۔ اجلاس کی قرارداد کے الفاظ یوں ہیں:

اوّلاً: ۔ الاسم التجاری والعنوان التجاری والعلامة التجارية والتاليف و الاختراع والابتكار :هی حقوق خاصة لاصحابها و أصبح لها فی العرف المعاصر قيمة مالية معتبرة لتمول الناس لها و هذه الحقوق يعتد بها شرعا فلايجوز الاعتداء عليها ۔

ثانيا: ۔ يجوز التصرف فی الاسم التجاری او العنوان التجاری او العلامة التجارية و نقل ای منها بعوض مالی اذا انتفى الغرر والتدليس و الغش باعتبار أن ذالك أصبح حقا ماليا ۔

ثالثا: ۔ حقوق التاليف والاختراع او الابتكار مصونة شرعا و لاصحابها حق التصرف فيها ولايجوز الاعتداء عليها ۔)) [بحواله موسوعة القضايا الفقيهة المعاصرة للدكتور علی احمد سالوس :ص۶۱۸،۶۱۹]

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تجارتی نام' عنوان اور تجارتی علامت' حق تالیف اور ایجاد وہ حقوق ہیں جو اپنے مالکان کے لیے خاص ہیں۔ دور حاضر کے عرف میں ان کی ایک معتبر مالی قیمت ہے اس لیے ان حقوق کو مالی معاوضہ کے بدلے دوسرے کے نام منتقل کرنا جائز ہے بشرطیکہ غرر' تدلیس اور دھوکے سے پاک ہوں۔ لہٰذا ان کے مالکان کو ان میں تصرف کا حق ہے اور ان حقوق پر زیادتی نہیں ہو سکتی۔

❀❀❀

پگڑی

پگڑی کا لین دین بھی ان مسائل میں سے ہے جن پر ہر بڑے شہر میں عمل ہو رہا ہے۔عربی میں پگڑی کے لیے''خلو'' کا لفظ آیا ہے۔جس کا معنی ہے خالی ہونا۔

علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی عمومی تعریف یوں کی ہے:

((ھو اسم لما یملکه دافع الدراھم من المنفعة التی دفع فی مقابلتھا الدراھم)) [الموسوعة الفقیھة،المادة خلوّ]

''درہم ادا کرنے والے کی زیر ملکیت وہ منفعت جس کے بدلے اس نے درہم ادا کیے ہوں۔''

پگڑی جس طرح ذاتی پراپرٹی میں ہوتی ہے اسی طرح وقف اور بیت المال کی اراضی میں بھی ہوتی ہے۔

اراضی وقف میں پگڑی کی صورتیں:

وہ منفعت جو وقف کے کرایہ دار نے ناظر وقف کو تعمیر کی غرض سے کچھ رقم ادا کر کے اس شرط پر حاصل کی ہوتی ہے کہ وہ وقف کی منفعت کے فیصد کے حساب سے ایک متعین حصہ مثلاً نصف یا ثلث کا مالک ہوگا اور باقی حصہ کا کرایہ ادا کرے گا۔

اراضی بیت المال میں پگڑی کی صورت:

سرکاری زمین کے کرایہ دار کا وہ حق جو اسے سرکاری زمین میں درخت لگانے،تعمیراتی کام کرنے یا مٹی ڈالنے کی وجہ سے زمین پر قبضہ باقی رکھنے کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔بشرطیکہ اس زمین کے حقوق خزانے کو ادا کرتا رہے۔[الموسوعة الفقیھة]

مگر ہمارے پیش نظر یہاں صرف ذاتی پراپرٹی میں پگڑی کا حکم معلوم کرنا ہے۔

ذاتی پراپرٹی میں پگڑی کا مفہوم:

وہ ناقابل واپسی رقم جو دُکان یا مکان کا مالک کرایہ دار سے ماہانہ کرایہ کے علاوہ یک مشت وصول کرتا ہے۔اس کے بعد مالک برائے نام مالک رہ جاتا ہے وہ دُکان وغیرہ میں کسی قسم کا تصرف نہیں کرسکتا۔ملکیت نامہ رکھنے کے باوجود نہ دُکان خالی کرواسکتا ہے اور نہ دوسرے کو کرایہ پر دے سکتا ہے تاوقتیکہ کرایہ دار اس پر آمادہ نہ ہو اور مالک مارکیٹ ریٹ کے مطابق کرایہ دار کو پگڑی ادا نہ کردے۔

پگڑی کی صورت میں دُکان یا مکان کی مرمت وغیرہ حتی کہ اگر کسی وجہ سے دُکان گر جائے اس کو دوبارہ تعمیر کرنا کرایہ دار کی ذمہ داری ہوتی ہے۔اگر کرایہ دار چاہے تو پگڑی بیچ کر قبضہ دوسرے کے حوالے بھی کرسکتا ہے۔اس صورت میں بعض دفعہ مالک سابق کرایہ دار سے پگڑی کا کچھ فیصد بھی وصول کرتا ہے۔پگڑی کی صورت میں کرایہ مارکیٹ ریٹ سے کافی کم ہوتا ہے

پگڑی کا فائدہ:

اس میں مالک اور کرایہ دار ہر دو کا فائدہ ہے۔کرایہ دار کا اس طرح کہ اس کو یہ اندیشہ نہیں رہتا کہ مالک جب چاہے گا دُکان خالی کروالے گا۔مالک کا اس طرح کہ وہ خود کو کرایہ دار کی زیادتی سے محفوظ سمجھتا ہے کیونکہ وہ پگڑی کے نام پر ایک معقول رقم پہلے ہی وصول کر چکا ہوتا ہے جب کہ باقی کرایہ کی صورت میں وصول کررہا ہوتا ہے۔

پگڑی کے مختلف نام:

عربی میں پگڑی کو عام طور پر''الخلو'' کہا جاتا ہے۔تاہم بعض ممالک میں دوسرے ناموں سے بھی معروف ہے۔عراق میں اس کو''السر قفلية ''(فارسی لفظ) کہتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ کرایہ دار معاوضہ لے کر دوسرے کے حق میں دستبردار ہو جائے۔

شام میں''الفروغ'' کہتے ہیں یعنی خالی کروانا۔خلو کے لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

مصر میں "المفتاح" یا"الزینة" کہا جاتا ہے۔

مفتاح کا لغوی معنی ہے چابی۔ پگڑی ادا کرنے کے بعد کرایہ دار تصرف کا مالک بن جاتا ہے اس لیے مفتاح کا نام دیا گیا۔

زینة کا معنی ہے ''ڈیکوریشن'' پگڑی ادا کر کے کرایہ دار مستقل رہنے کے لیے دُکان سجاتا ہے اس لیے الزینة کہا جاتا ہے۔

مغرب یعنی تیونس، الجزائر وغیرہ میں ''الجلسة'' کے نام سے معروف ہے جس کا معنی ہے بیٹھنا۔ پگڑی کے بعد کرایہ دار کو رہائش کا مستقل حق مل جاتا ہے اس لیے ''الجلسة'' کا نام دیا جاتا ہے:[المعاملات المالية المعاصرة فی الفقه الاسلامی للدکتور محمد عثمان شبیر]

پگڑی کی تاریخ وارتقاء:

اگر چہ قرآن وحدیث اور ائمہ حدیث وفقہ کے دور میں پگڑی کا ذکر نہیں ملتا لیکن اس کا یہ معنی بھی نہیں کہ یہ عصر حاضر کی پیداوار ہے بلکہ اس کا تصور کئی صدیاں پرانا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی حفظہ اللہ لکھتے ہیں

((واوّل ظهور مسألة الخلو کان فی الاندلس فی أواخر القرن التاسع الهجری فی مجال عقارات الاوقاف التی تحتاج الی ترمیم واصلاح وعمارة وبناء وزراعة واستثمار)) [المعاملات المالية المعاصرة:ص ٥٦١]

سب سے پہلے پگڑی کا آغاز نویں صدی ہجری میں اندلس میں اوقاف کی ان زمینوں سے ہوا جو ترمیم واصلاح، عمارت وبناء اور زراعت وسرمایہ کاری کی متقاضی تھیں۔

دسویں صدی ہجری کے مالکی فقیہ ابوعبداللہ محمد بن الحسن اللقانی (۸۷۳تا۹۵۸) کا اس موضوع پر ایک فتوی بھی ہے جس کے متعلق علامہ حموی حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وان نوزع فيه وقد اشتهرت فتياه في المشارق والمغارب و تلقاها علماء عصره بالقبول و هبت عليها نسيمات الصباوالقبول))

[غمز عيون البصائر في شرح الاشتباه والنظائر: ج ۲ ص ۱۷۳]

''اگر چہ اس کے متعلق ان سے اختلاف کیا گیا ہے لیکن ان کا فتویٰ مشرق ومغرب میں مقبول ہے اور اس دور کے علماء نے اسے قبولیت بخشی ہے اور اس پر شوق وقبولیت کی ہوا کے جھونکے چلے ہیں۔''

دسویں صدی ہجری کے نصف اول تک قاہرہ کی مارکیٹوں میں اس کا خاصا رواج ہو چکا تھا۔

چنانچہ علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

((فأقول على اعتباره :ينبغي أن يفتى بأ ن مايقع في بعض أسواق القاهرة من خلو الحوانيت لازم ويصير الخلو في الحانوت حقا له فلا يملك صاحب الحانوت اخراجه منها ولا اجارتهالغيره ولو كانت وقفا))[الاشتباه والنظائر مع غمزعيون البصائر :ج ۲ ص ۱۶۸]

''میں کہتا ہوں کہ عرف خاص کا اعتبار کر کے قاہرہ کے بعض بازاروں میں دُکانوں میں رائج پگڑی کے جواز کا فتویٰ دینا چاہیے اور یہ فتویٰ دینا چاہیے کہ پگڑی کرایہ دار کا حق ہے۔ دُکان کا مالک نہ تو اس کو نکال سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو دے سکتا ہے خواہ وہ وقف ہی کیوں نہ ہو۔''

مزید لکھتے ہیں:

((و قد وقع في حوانيت الجملون بالغورية أن السلطان الغوري لما بناها أسكنهاللتجار بالخلو))[ایضًا۔ ج ۲، ص ۱۶۸]

''سلطان غوری نے غوریہ میں جب جملون کی دُکانیں تعمیر کیں تو تاجروں کو پگڑی پر دی تھیں۔''

پگڑی کا حکم:

پگڑی کی رقم کس چیز کا معاوضہ ہے، اس بارہ میں علماء کے مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں درست رائے کے مطابق یہ درحقیقت مالک کے اس حق کا معاوضہ ہے جو اسے دُکان خالی کروانے اور دوسرے کو کرایہ پر دینے کی صورت میں حاصل تھا۔ کرایہ دار پگڑی ادا کر کے یہ حق خرید لیتا ہے تاہم اس کا جواز اس امر پر موقوف ہے کہ آیا اس سے کسی شرعی اصول کی خلاف ورزی تو لازم نہیں آتی۔ ہمارے خیال میں درج ذیل وجوہ کے باعث اس کا جواز محل نظر ہے۔

- بنیادی طور پر یہ اجارہ کا معاہدہ ہے جس میں کرایہ پر دی ہوئی چیز کرایہ دار کے پاس امانت ہوتی ہے۔ نقصان کا ذمہ دار خود مالک ہوتا ہے بشرطیکہ اس میں کرایہ دار کی زیادتی یا معاہدے کی خلاف ورزی کا دخل نہ ہو۔ چنانچہ الموسوعة الفقيهة میں ہے۔

((والدار المستأجرة تكون أمانة فى يد المستأجر فلا يضمن الا بالتعدى أو المخالفة))

''کرایہ پر دیا ہوا گھر کرایہ دار کے پاس امانت ہوتا ہے وہ صرف زیادتی اور معاہدے کی خلاف ورزی کی صورت میں نقصان کا ذمہ دار ہوگا۔''

پگڑی میں اس بات کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اسی طرح گھر کی ایسی مرمت جس سے رہائش میں خلل واقع ہوتا ہو وہ بھی مالک کی ذمہ داری ہوتی ہے جیسا کہ ''الموسوعة الفقيهه'' میں ہے۔

((كما يلزم الموجر عمارة الدار اصلاح كل ما يخل بالسكنى فان أبى حق المستأجر فسخ العقد الا اذا كان استأجر ها على حالها))

''گھر کی تعمیر اور رہائش میں مخل نقصان کی اصلاح کرایہ پر دینے والے کی ذمہ داری ہے، اگر وہ انکار کرے تو کرایہ دار کو عقد فسخ کرنے کا حق ہے الا کہ انھوں نے اجارہ ہی اس حالت پر کیا ہو۔''

پگڑی کی صورت میں مالک بالکل بے تعلق ہو جاتا ہے کرایہ دار جانے اور مکان۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مرمت وغیرہ کی ذمہ داری معاہدے میں شرط ہوتی ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ فقہاء کے نزدیک ایسی شرط سے اجارہ فاسد ہو جاتا ہے۔چنانچہ علامہ سرخسی حنفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((فان اشترط المرمة على المستأجر فسدت الاجارة لان المرمة على الآجر)) [المبسوط :ج۱۵ص۱۵۷]

''اگر یہ شرط لگائے کہ مرمت کرایہ دار کی ذمہ داری ہو گی تو اجارہ فاسد ہو جائے گا کیونکہ مرمت کرایہ پر دینے والے کی ذمہ داری ہے۔''

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا ایک آدمی اس شرط پر مکان کرایہ پر دیتا ہے کہ اس کی لکڑی ٹوٹی یا گھر کو معمولی مرمت کی ضرورت پیش آئی تو یہ کرایہ دار کی ذمہ داری ہو گی؟ تو انہوں نے فرمایا:

((لا خير في ذلك الا ان يشترط من كرائها)) [المدونة الكبرى: ج۱۱، ص۵۰۹]

''اس میں کوئی خیر نہیں الا کہ ان اخراجات کو کرایے سے منہا کرنے کی شرط ہو تو پھر جائز ہے۔''

❁ اجارہ کی مدت متعین ہونی چاہیے۔الموسوعة الفقيهة میں ہے۔

((وبيان المنفعة في اجارة الدور ببيان المدة فقط))

''گھروں کے اجارہ میں منفعت کی وضاحت فقط اجارہ کی بیان کرنے سے ہو گی۔''

پگڑی میں اجارہ غیر محدود وقت کے لیے ہوتا ہے۔

بعض حضرات کے خیال میں یہاں مدت مجہول نہیں بلکہ یہ ابدی اجارہ ہے مگر اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کیا شریعت میں ابدی اجارہ کا تصور پایا جاتا ہے؟ فقہ حنبلی کی معروف کتاب''زاد المستنقع ''میں بیع کی تعریف میں''على التأبيد''کے الفاظ ذکر ہوئے

ہیں۔امام بہوتی رحمہ اللہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

((یخرج الاجارۃ)) [الروض المربع: ص ۲۷۵]

''یہ قید اجارہ کو بیع سے خارج کر رہی ہے۔''

یعنی بیع ابدی ہوتی ہے جبکہ اجارہ محدود مدت کے لیے۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

((وعلی واضعی القوانین الایجاریة اعادة النظر مسألتی تأبید الاجارة وتجمید الاجرة لان اجارة محدودة المدة وتعتمد علی التراضی بین المالك و المستأجر ولان تجمید الاجرة ینافی العدل)) [المعاملات المالیة المعاصرة:ص ۵٦۷]

''اجارۃ کے قوانین وضع کرنے والوں پر لازم ہے کہ وہ ابدی اجارے اور اجرت منجمد کرنے کے مسئلہ پر نظر ثانی کریں کیونکہ اجارہ محدود مدت کے لیے ہوتا ہے مالک اور کرایہ دار کی رضا مندی پر منحصر ہوتا ہے اور اس لیے بھی کہ اجرت منجمد کرنا عدل کے منافی ہے۔''

❁ تمام فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ درج ذیل صورتوں میں عقد اجارہ ختم ہو جاتا ہے۔

۱۔ مدت ختم ہو جائے۔

۲۔ اجارہ پر دی ہوئی چیز تباہ ہو جائے۔

۳۔ اجارہ واپس کرنے کی صورت میں۔

چنانچہ الموسوعة الفقیهة میں ہے:

((اتفق الفقهاء علی ان الاجارة تنتهی بانتهاء المدة أو بهلاك المعقود علیه المعین أو بالاقالة))

''فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ اجارہ مدت ختم ہونے یا اجارہ پر دی ہوئی چیز تباہ ہو جانے یا اجارہ واپس کرنے کی صورت میں ختم ہو جاتا ہے۔''

پگڑی میں یہ بات نہیں ہوتی بلکہ اگر کسی وجہ سے دُکان گر بھی جائے تو کرایہ دار کو کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے اور دُکان کی دوبارہ تعمیر بھی اس کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

❀ بعض کی رائے میں پگڑی سے مالک جائیداد اپنے حق تصرف سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ قائلین اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ مالک نے یہ شرط ازخود قبول کی ہوتی ہے اور اس کا معاوضہ بھی وصول کیا ہوتا ہے۔

ملاحظہ:

بعض دفعہ مالک طے شدہ مدت سے پہلے ہی دُکان خالی کروانا چاہتا ہے کرایہ دار اس وقت تک خالی کرنے کے تیار نہیں ہوتا جب تک مالک کچھ رقم ادا نہ کر دے اس کو بھی پگڑی کہہ دیتے ہیں۔ مگر یہ جائز ہے کیونکہ طے شدہ مدت تک وہاں رہنا کرایہ دار کا حق ہے جو سلب نہیں کیا جا سکتا۔ اگر مالک وقت سے پہلے قبضہ لینا چاہتا ہے تو کرایہ دار کے لیے اس حق کا معاوضہ لینا جائز ہے۔

بیع قسط

دورحاضر میں جن معاملات کووسیع پیمانے پرفروغ حاصل ہوا ہےان میں قسطوں پرخرید وفروخت بھی شامل ہےاس کوعربی میں ''البیع بالتقسیط'' کہاجاتا ہےجس کامفہوم یہ ہے کہ چیزتو فورامشتری کے حوالے کردی جائے مگراس کی قیمت طےشدہ اقساط میں وصول کی جائے قسط کونجم بھی کہتے ہیں۔جس کامعنی ہے''ستارہ''شارح بخاری علامہ وحیدالزماں رحمۃ اللہ علیہ اس کی وجہ تسمیہ میں فرماتے ہیں:

''عرب میں تمام معاملات تاروں کےطلوع پرہوا کرتے تھے کیونکہ وہ حساب نہیں جانتے تھے وہ یوں کہتے تھے کہ جب فلاں تارہ نکلے گا تو یہ معاملہ ہوگا اسی وجہ سے قسط کو نجم کہنے لگے۔'' [تیسیر الباری: ج ۲، ص٦٢٦]

بعض لوگ اس کوموجودہ دور کی ایجاد سمجھتے ہیں جو درست نہیں اس کارواج تو عہد رسالت وصحابہ میں بھی موجود تھا جیسا کہ ذیل کے دوواقعات سے ثابت ہوتا ہے

پہلا واقعہ:

((عَنْ عَمْرِو بْنِ الشَّرِيْدِقَالَ وَقَفْتُ عَلٰى سَعْدِبْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ فَجَاءَ الْمِسْوَرُبْنُ مَخْرَمَةَ فَوَضَعَ يَدَهٗ عَلٰى اِحْدٰى مَنْكِبَیَّ اِذْجَاءَ اَبُوْ رَافِعٍ مَوْلَى النَّبِیِّ صلى الله عليه وسلم فَقَالَ يَا سَعْدُ اِبْتَعْ مِنِّیْ بَيْتَیَّ فِیْ دَارِكَ فَقَالَ سَعْدُ:وَاللّٰهِ مَا اَبْتَاعُهُمافَقَالَ الْمِسْوَرُ :وَاللّٰهِ لَتَبْتَاعَنَّهُمافَقَالَ سَعْدُ:وَاللّٰهِ لَا اَزِيْدُكَ عَلٰى اَرْبَعَةِ الَافٍ مُنَجَّمَةٍ اَوْمُقَطَّعَةٍ قَالَ اَبُوْ رَافِعٍ:لَقَدْ اُعْطِيْتُ بِهَاخَمْسَ مِائَةِ دِيْنَارٍ وَلَوْ لَااَنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ : ((اَلْجَارُ اَحَقُّ بِسَقَبِهٖ))مَا اَعْطَيْتُكَهَابِاَرْبَعَةِالَافٍ وَاَنَااُعْطٰى

بِهَا خَمُسَ مِائَةِ دِيُنَارٍ)) [صحیح بخاری: باب عرض الشفعة علی صاحبها قبل البیع]

''عمرو بن شرید کہتے ہیں کہ میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے پاس کھڑا تھا، اتنے میں مسور بن مخرمہ آئے انھوں نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا۔ اتنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ابو رافع آ گئے۔ انہوں نے کہا: اے سعد آپکے محلے میں میرے جو دو گھر ہیں وہ آپ خرید لیں۔ سعد نے کہا: اللہ کی قسم: میں نہیں خریدتا۔ حضرت مسور نے کہا کہ اللہ کی قسم آپکو ضرور خریدنا ہوں گے۔ تب سعد نے کہا میں چار ہزار درہم سے زیادہ نہیں دوں گا وہ بھی قسطوں میں۔ ابو رافع نے کہا کہ مجھے ان گھروں کے پانچ سو دینار (نقد) ملتے تھے اور اگر میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے نہ سنا ہوتا کہ پڑوسی اپنے قرب کی وجہ سے زیادہ حق دار ہے تو میں آپ کو یہ گھر چار ہزار درہم میں بھی نہ دیتا۔ جب کہ مجھے ان کے پانچ سو دینار (نقد) ملتے تھے۔''

دوسرا واقعہ:

((قَالَ عُرُوَةُ: قَالَتُ عَائِشَةُ رضی الله عنها اِنَّ بَرِيُرَةَ دَخَلَتُ عَلَيُهَا تَسْتَعِيُنُهَا فِيُ كِتَابَتِهَا وَ عَلَيُهَا خَمُسَةُ اَوَاقٍ نُجِّمَتُ عَلَيُهَا فِيُ خَمُسِ سِنِيُنَ))

[صحیح بخاری: کتاب المکاتب]

''عروہ کا بیان ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: بریرہ رضی اللہ عنہا ان کے پاس اپنی مکاتبت میں مدد کے سلسلے میں حاضر ہوئی اس کے ذمہ پانچ اوقیہ چاندی تھی جو اس نے پانچ سالانہ اقساط میں ادا کرنا تھی۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں اس پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے:

((باب المکاتب و نجومه فی کل سنة نجم))

''مکاتب اور اس کی قسطوں کا بیان ہر سال میں ایک قسط۔''

بیع قسط چونکہ بیع مؤجل ہی کی ایک شکل ہے۔ جس میں چیز کی قیمت بیک مشت ادا

کرنے کی بجائے اقساط مقرر کر دی جاتی ہیں۔اس لے ہمارے فقہاء نے اس کو الگ عنوان میں ذکر کرنے کی بجائے عموماً بیع مؤجل کے ضمن میں ہی بیان کیا ہے۔

قسطوں پر خریداری کی مختلف صورتیں:

ادھار یا قسطوں پر خریداری کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ نقد اور ادھار دونوں صورتوں میں ایک ہی قیمت ہو۔ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے تاہم اس کے جواز میں کوئی کلام نہیں۔

۲۔ ادھار میں نقد سے زیادہ قیمت وصول کی جائے۔مثلاً یوں کہا جائے کہ یہ چیز نقد سو روپے کی اور ادھار ایک سودس کی ہوگی۔اس کے بارہ میں تین نقطہ نظر ہیں۔

(۱) جمہور فقہاء و محدثین رحمہم اللہ کی رائے میں یہ جائز ہے۔

چنانچہ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَقَالَتُ الشَّافِعِيَّةُ وَالْحَنَفِيَّةُ وَزَيْدُ بْنُ عَلِيٍّ وَالْمُؤَيَّدُ بِاللّٰهِ وَالْجُمْهُوْرُ إِنَّهُ يَجُوْزُ)) [نيل الاوطار: ج۸، ص ۲۰۱]

''شافعیہ' حنفیہ' زید بن علی' مؤید باللہ اور جمہور اس کے جواز کے قائل ہیں''

اہل حدیث علماء میں سے سید میاں نذیر حسین محدث دہلوی، نواب صدیق حسن خان اور حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمہم اللہ بھی اس کو جائز قرار دیتے ہیں۔[فتاویٰ نذیریہ: ج۲، ص ۱٦۲۔الروضة الندیه: ج۲ص۸۹۔فتاویٰ اهل حدیث: ج۲، ص۲٦۳، ۲٦٤]

سعودی عرب کے سابق مفتی اعظم شیخ ابن باز رحمہ اللہ بھی اس کے جواز کے حامی ہیں چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''قسطوں کی بیع میں کوئی حرج نہیں جب کہ مدت اور قسطیں معلوم ہوں خواہ قسطوں کی صورت میں قیمت نقد قیمت سے زیادہ ہو کیونکہ قسطوں کی صورت میں بائع اور مشتری دونوں فائدہ اٹھاتے ہیں۔بائع زیادہ قیمت سے اور مشتری مہلت سے فائدہ اٹھاتا ہے۔''[فتاوی اسلامیة: ج ۲، ص ٤٤٥]

اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ نے بھی اپنے چھٹے اور ساتویں اجلاس میں جو بالترتیب سترہ تا تیس شعبان ۱۴۱۰ھ اور سات سے بارہ ذیقعدہ ۱۴۱۲ھ کو جدہ میں ہوئے' اس کو جائز قرار دیا ہے۔ چھٹے اجلاس کی قرارد کے متعلقہ الفاظ یہ ہیں:

((تجوز الزيادة فى الثمن المؤجل عن الثمن الحال كما يجوز ذكر ثمن المبيع نقدا و ثمنه بالاقساط بمدة معلومة))[موسوعة القضايا الفقهية المعاصرة و الاقتصاد الاسلامى للدكتور على احمد سالوس]

''ادھار میں نقد سے زیادہ قیمت جائز ہے۔ جس طرح چیز کی قیمت نقد اور متعینہ اقساط میں ذکر کرنا جائز ہے۔''

ساتویں اجلاس کے الفاظ یوں ہیں:

((البيع بالتقسيط جائز شرعا ولو زاد فيه ثمن المؤجل على المعجل)) [ايضًا]

''بیع قسط شرعاً جائز ہے خواہ اس میں ادھار قیمت نقد سے زیادہ ہو۔''

(۲) امام ابن حزم، امام ابن سیرین اور زین العابدین عدم جواز کے قائل ہیں۔

محدث البانی رحمہ اللہ بھی اسی نقطہ نظر کے حامی ہیں۔[سلسلة الاحاديث الصحيحة: ج ۵]

(۳) حضرات طاؤس' ثوری' اور اوزاعی کی رائے میں یہ ہے تو ناجائز لیکن اگر بائع اس طرح سودا ہونے کے بعد دو قیمتوں میں سے کم یعنی نقد والی قیمت وصول کرے تو جائز ورنہ ناجائز۔[سلسلة الا حاديث الصحيحة : ج ۵]

قائلین جواز کے دلائل:

جو حضرات اس کے حق میں ہیں ان کا استدلال ایک تو اس بات سے ہے کہ معاملات میں اصل اباحت ہے۔ یعنی کاروبار کی ہر وہ صورت جائز ہے جس سے شریعت نے منع نہ کیا ہو۔ قرآن حکیم کی آیت: ﴿وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ﴾ ''اللہ تعالی نے بیع کو حلال کیا ہے'' سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ سوائے ان بیوع کے جن کی حرمت قرآن وحدیث میں واضح کردی

گئی ہے، ہر قسم کی بیع جائز ہے، اور قرآن و حدیث میں کوئی ایسی نص موجود نہیں جس سے اس کی ممانعت ثابت ہوتی ہو۔ ان حضرات کی دوسری دلیل ذیل کا واقعہ ہے:

((عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم أَمَرَهُ أَنْ يُجَهِّزَ جَيْشًا فَنَفِدَتِ الْإِبِلُ فَأَمَرَهُ أَنْ يَأْخُذَ فِي قِلَاصِ الصَّدَقَةِ فَكَانَ يَأْخُذُ الْبَعِيرَ بِالْبَعِيرَيْنِ إِلَى إِبِلِ الصَّدَقَةِ)) [سنن ابی داؤد کتاب البیوع: باب فی الرخصة فی ذلك]

''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جیش تیار کرنے کا حکم دیا تو اونٹ کم پڑ گئے' اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقے کے اونٹ آنے تک ادھار لے لو۔ تو انہوں نے لوگوں سے اس شرط پر اونٹ لیے کہ جب صدقے کے اونٹ آئیں گے تو ایک کے بدلے دو دو دیے جائیں گے۔''

مانعین کے دلائل:

جو حضرات اس کی ممانعت کے قائل ہیں ان کی پہلی دلیل یہ ہے:

- ادھار کی صورت میں اضافی رقم اصل میں مدت کا معاوضہ ہے اور مدت کا معاوضہ لینا سود ہے۔
- اس رائے کے حق میں دوسری دلیل وہ روایات ہیں جن میں ایک بیع میں دو بیعوں کی ممانعت بیان ہوئی ہے۔ مثلاً:

((نَهٰى رَسُولُ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِيْ بَيْعَةٍ))

[ترمذی: کتاب البیوع، باب مَا جَاءَ فِي النَّهْيِ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِيْ بَيْعَةٍ]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیع میں دو بیعوں سے منع کیا ہے۔''

((نَهٰى رَسُولُ اللّٰهِ -صلی الله علیه وسلم- عَنْ صَفْقَتَيْنِ فِيْ صَفْقَةٍ وَاحِدَةٍ)) [مسند احمد بن حنبل: ج۸، ص۳۸۳]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سودے میں دو سودوں سے منع کیا ہے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ انسان یہ کہے:

((وان كان بنقد فبكذا وان كان بنسيئة فبكذا))[مصنف ابن ابی شيبة: ج ٥ ص ٥٤]

''اگر نقد ہو تو اتنے کی اور ادھار ہو تو اتنے کی۔''

راجح نقطہ نظر:

ہمارے خیال میں حسب ذیل وجوہ کے باعث ان لوگوں کی رائے زیادہ وزنی ہے جو جواز کے حق میں ہیں۔

- ادھار کی صورت میں اضافے کا جواز خود قرآن کی آیت ﴿وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ﴾ سے ثابت ہے۔ کیونکہ یہ آیت ان لوگوں کے رد میں نازل ہوئی ہے جیسا کہ ابن جریر طبری، علامہ ابن العربی' اور امام رازی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ جن کا اعتراض یہ تھا کہ جب عقد بیع کے وقت ادھار کی زیادہ قیمت مقرر کی جا سکتی ہے تو پھر وقت پر ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں اضافہ کیوں نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کہتے دونوں صورتیں یکساں ہیں۔

چنانچہ رئیس المفسرین امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((وذلك أن الذين كانوا يأكلون من الرّبا من أهل الجاهلية، كان إذا حلّ مالُ أحدهم على غريمه، يقول الغَريم لغريم الحق زدني في الأجل وأزيدك في مالك فكان يقال لهما إذا فعلا ذلك هذا ربًا لا يحل فإذا قيل لهما ذلك قالا سواء علينا زدنا في أول البيع، أو عند مَحِلّ المال فكذّبهم الله في قيلهم)) [تفسیر طبری]

''اہل جاہلیت میں سے جو لوگ سود کھاتے تھے، اس کی صورت یہ ہوتی کہ جب کسی کا دوسرے کے ذمے مال ہوتا جس کی ادائیگی کا وقت آ چکا ہوتا وہ صاحب حق سے کہتا آپ مدت میں اضافہ کر دیں میں آپ کے مال میں اضافہ کرتا ہوں۔ جب ان سے کہا جاتا کہ یہ تو سود ہے جو حلال نہیں تو کہتے کہ ہم بیع کے آغاز میں اضافہ کریں یا مدت

پوری ہونے پر، دونوں صورتیں یکساں ہیں۔ تو اللہ تعالی نے ان کی تردید فرمائی۔"

مشہور محدث ومفسر علامہ ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ قمطراز ہیں:

((وكانت تقول انما البيع مثل الربا اى انما الزيادة عند حلول الاجل آخراً مثل اصل الثمن من اول العقد ورد الله عليهم قولهم))[احكام القرآن]

"اہل جاہلیت کہتے تھے بیع سود کی مثل ہی ہے یعنی مدت پوری ہونے پر جو اضافہ کیا جاتا ہے وہ شروع عقد میں اصل قیمت میں اضافہ کی مانند ہے تو اللہ تعالی نے ان کے اس قول کا رد فرمایا ہے۔"

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((القوم كانوا فى تحليل الربا على هذه الشبهة وهى ان من اشترى ثوبا بعشرة ثم باع باحد عشر فهذا حلال فكذا اذا باع العشرة باحد عشر يجب ان يكون حلال لانه لا فرق فى العقل بين الامرين فهذا فى ربا النقد واما فى ربا النسيئة فكذلك ايضا لانه لو باع الثوب الذى يساوى عشرة فى الحال باحد عشر الى شهر جاز فكذا اذا اعطى العشرة باحد عشر الى شهر وجب ان يجوز لانه لافرق فى العقل بين الصورتين)) [التفسير الكبير]

"ربا کو حلال قرار دینے کے متعلق لوگوں کا شبہ یہ تھا کہ جب کوئی شخص ایک کپڑا دس کا خرید کر گیارہ کا بیچے تو یہ جائز ہے اسی طرح جب دس (درہم) گیارہ کے بیچے تو معاملہ بھی جائز ہونا چاہیے۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں عملاً کوئی فرق نہیں ہے یہ شبہ تو ربا النقد کے متعلق تھا۔" ربا النسیئۃ "کے بارہ میں یہ شبہ تھا کہ وہ کپڑا جس کی نقد قیمت دس (درہم) ہے اگر وہ ایک مہینہ کے ادھار پر گیارہ کا بیچے تو یہ جائز ہے اسی طرح اگر دس (درہم) دے کر مہینے بعد گیارہ لے تو یہ بھی جائز ہونا چاہیے کیونکہ عقلی اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔"

ان جلیل القدر ائمہ تفسیر کے بیان سے ثابت ہوا کہ اھل جاھلیت کی اصل غلطی یہ تھی کہ وہ وقت پر ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں اصل دین پر اضافہ کو ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت لینے پر قیاس کرتے تھے۔تو اللہ تعالیٰ نے اس کا رد کرتے ہوئے فرمایا،ادھار کی صورت میں قیمت میں اضافہ کرنا بیع میں شامل ہے جو جائز ہے جبکہ بروقت ادائیگی نہ کرنیکی صورت میں اضافہ سود ہے جو حرام ہے

- ہر مدت کا معاوضہ سود نہیں ہوتا۔مہلت کا اضافہ تب سود بنتا ہے جب انسان کے ذمہ قرض،دَین(Debt) کی تاخیر یا اموال ربویہ کے تبادلے کی صورت میں ہو۔

نبی ﷺ نے سونے کے سونے کے ساتھ تبادلے میں دو شرطیں لگائیں ہیں:

۱۔ برابر برابر ہو۔

۲۔ دونوں جانب سے نقد ہو۔

اگر اسلام میں مدت کی قیمت کا اعتبار نہ ہوتا تو دونوں طرف سے نقد کی قید لگانے کی ضرورت نہ تھی۔نیز ادھار کی صورت میں اضافہ بیع کے ضمن میں ہے اس لیے جائز ہے۔ فقہاء کرام نے بیع کے ضمن میں مدت کے اضافہ کو جائز قرار دیا ہے۔تفصیل کے لیے دیکھیے:''المعاملات المالية المعاصرة:للدكتور وهبة زحيلى حفظه الله۔''

- یہ اضافہ ربا کی کسی قسم میں شامل نہیں۔اس کا اقرار ان لوگوں کو بھی ہے جو اس کے مخالف ہیں۔چنانچہ مفتی سیاح الدین کاکاخیل رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ادھار کی وجہ سے جو ثمن میں اضافہ کیا جاتا ہے اس کو عین ربا اور ربا حقیقی کی طرح حرام نہیں کہا جا سکتا کیونکہ فقہاء کرام اور حضرات مفسرین نے حقیقی ربا کی جو تعریف کی ہے اس کے مطابق یہ ربا کی تعریف میں داخل نہیں ہے۔[حکمت قرآن:جنوری ۱۹۹۲،ص ۱۴]

مزید لکھتے ہیں:

''سود سے اس کا فرق دو وجھوں سے ہے۔ایک تو یہ دَین پر اضافہ نہیں بلکہ شروع ہی

سے ثمن مہنگا بتلا دینا ہے وہ اضافہ محض اس کے ذہن میں ہے نیز مدت کے بڑھنے کے ساتھ اس زیادتی میں اضافہ نہیں ہوتا۔'' [ماہنامہ حکمت قرآن: جنوری ۱۹۹۲ء، ص ۱۶]

❁ محدثین کرام اور فقہاء عظام نے ''بیعتین فی بیعة '' کے مختلف مفاہیم بیان کے ہیں۔

✵ بائع یہ کہے کہ یہ کپڑا نقد دس کا اور ادھار بیس کا۔ مشتری کسی ایک قیمت کا تعین کیے بغیر خرید لے۔

✵ یہ کہا جائے کہ میں اپنا گھر تجھے اتنے میں بیچتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ نے اپنا غلام اتنے میں مجھے بیچنا ہے۔

✵ انسان کسی چیز کا سودا کرے مثلاً ایک قفیز گندم کا اور اس کی قیمت پیشگی ادا کر دے۔ گندم کی ادائیگی کیلیے ایک مہینہ مدت مقرر ہو جائے۔ جب مقررہ وقت آئے تو فروخت کنندہ کہے کہ وہ گندم آپ مجھے دو مہینے کی مدت کے لے دو قفیز کے عوض فروخت کر دیں۔[تحفة الاحوذی]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس سے بیع عینہ مراد ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

((وفی السنن عن النبی ﷺ انہ قال ((من باع بیعتین فی بیعة، فلہ اوکسھا او الربا))و فیہ ایضا عن النبی ﷺ انہ قال اذا تبایعتم بالعینة و اتبعتم اذناب البقر و ترکتم الجھاد فی سبیل اللہ ارسل اللہ علیکم ذلا لا یرفعہ عنکم حتی ترجعوا الی دینکم و ھذا کلہ فی بیعة العینة وھو بیعتان فی بیعة))[مجموع فتاوی: ج:۲۹ ص ۴۳۲]

من باع بیعتین اور اذاتبایعتم بالعینة یہ سب بیع عینہ کے متعلق ہیں اور یہی ایک بیع میں دو بیعیں کرنے کا معنی ہے۔

پہلی صورت کے ناجائز ہونے کی علت قیمت کا متعین نہ ہونا ہے۔ دوسری صورت میں

بیع کو مستقبل کی شرط پر معلق کیا گیا ہے' اور آخری دو صورتوں میں ربا لازم آتا ہے جبکہ بیع تقسیط ان سب سے الگ ہے۔

- مانعین کا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی تشریح سے استدلال درست نہیں کیونکہ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ مشتری ایک قیمت طے کئے بغیر چیز اٹھا کر لے جائے احتمال کی صورت میں جمہور کی تشریح ہی معتبر ہو گی۔ جنہوں نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ مشتری نقد یا ادھار کی صراحت کیے بغیر چیز اٹھا کر لے جائے۔

ملاحظہ:

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ یہ جواز صرف اس وقت ہے جب ادائیگی میں تاخیر پر اضافی رقم خواہ وہ جرمانہ کے نام پر ہو وصول نہ کی جائے۔

دونوں صورتوں میں فرق ہے۔ پہلی صورت میں جب چیز ایک قیمت طے ہو جاتی ہے تو پھر اس میں اضافہ ممکن نہیں ہوتا خواہ ادائیگی مدت مقررہ پر کی جائے یا تاخیر کرکے۔

دوسری صورت میں فریقین کے درمیان طے ہونے کے بعد تاخیر پر جرمانہ وصول کیا جاتا ہے۔ جو زمانہ جاہلیت کے سود "اما تقضی واما ان تربی" یا ادا کرو یا اضافہ کرو میں داخل ہے جو سراسر ناجائز ہے۔

ہمارے ہاں چونکہ قسطوں کی خرید وفروخت میں عموماً تاخیر پر جرمانہ عائد کیا جاتا ہے لہٰذا اس کو مطلق جائز قرار دینا درست نہیں ہے۔

خلاصہ

- کریڈٹ اور چارج کارڈز سودی ہیں لہٰذا ان کا استعمال حرام ہے۔
- ڈیبٹ کارڈ کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔
- کمرشل انشورنس کی تمام قسمیں ناجائز ہیں۔
- روائتی بینکوں میں رائج لیزنگ سودی معاملہ ہے۔

❁ سٹاک مارکیٹ میں بیع کی سادہ صورت میں شیئرز کا لین دین درست ہے مگر فیوچر سیل اور بدلہ جائز نہیں۔

❁ لین دین میں ہنڈی، پرومزری نوٹ اور چیک کے استعمال میں شرعا کوئی خرابی نہیں سوائے ان مواقع کے جہاں دونوں یا ایک جانب سے نقد ہونا شرط ہے۔

❁ بینک کے ذریعے ان کی وصولی اور اس پر معاوضہ دینا بھی جائز ہے۔

❁ جلد وصولی کی غرض سے بٹہ لگوانا سود میں شامل ہیں
پگڑی اجارہ قوانین کے خلاف ہے لہٰذا یہ درست نہیں۔

❁ ادھار میں نقد سے زیادہ قیمت لگائی جاسکتی ہے۔

❁ اکثر محدثین عظام نے ایک بیع میں دو بیع کی جو تشریح کی ہے بیع قسط اس میں شامل نہیں۔

❁ ادائیگی میں تاخیر پر جرمانہ عائد کرنا سود ہے۔

❁❁❁

اسلامی بینکاری کی حقیقت!

تمہید:

گزشتہ چند سالوں کے دوران اسلامی بینک کاری نے غیر معمولی ترقی کی ہے اس وقت دنیا کے تقریباً ۷۵ ممالک میں اسلامی بینک کام کر رہے ہیں ان میں بعض غیر مسلم ممالک بھی شامل ہیں۔صرف پاکستان میں مختلف بینکوں کی تین سو سے زائد برانچوں میں اسلامی بینکاری کے نام پر کام ہو رہا ہے۔ان میں سے بعض بینک تو مکمل طور پر اسلامی بینک کہلاتے ہیں جیسے میزان بینک ،البرکہ بینک ،بینک اسلامی پاکستان اور دبئی اسلامی بینک وغیرہ ۔جبکہ بعض بنیادی طور پر تو سودی ہیں مگر ان میں اسلامی بینکاری کا شعبہ بھی قائم ہے اسلامی بینکاری کے حامی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ نظام نہ صرف کامیابی سے چل رہا ہے بلکہ تیز رفتاری سے ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔اور سرمایہ کاروں کی بڑی تعداد اس جانب راغب ہو رہی ہے۔عام لوگوں کا اعتماد بھی بڑھ رہا ہے۔جبکہ دوسری طرف علوم دینیہ کے ماہر علماء کی غالب اکثریت کے نزدیک یہ ایک مشکوک معاملہ ہے۔ بلکہ بعض حضرات تو اسکو اسلام کے نام پر دھوکا اور فراڈ قرار دیتے ہیں ان کی رائے میں یہ اصل میں سراسر سودی نظام ہے کیونکہ عملاً دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے سوائے اسکے کہ اسلامی بینک شرعی اصطلاحات مرابحہ،اجارہ اور مشارکہ وغیرہ استعمال کرتے ہیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلامی بینکاری ایک سازش ہے جس کا مقصد ان لوگوں کی دولت سے فائدہ اٹھانا ہے جو سود سے نفرت کرتے ہیں اور وہ اپنے اس عقیدہ کی بنیاد پر روایتی بینکوں کے ساتھ کوئی معاملہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اسلامی بینکوں پر تنقید کی وجوہ:

ہمارے خیال میں اسلامی بینکنگ پر ہونے والی اس تنقید کے پیچھے یہ سوچ ہرگز نہیں ہے کہ ہماری معیشت کے لیے سودی نظام ناگزیر ہے یا اس جدید دور میں شرعی احکام قابلِ عمل نہیں رہے" نعوذ باللہ من ذلك "بلکہ یہ شکوک وشبہات خود اسلامی بینک کاری کی عملی تطبیق کے پیدا کردہ ہیں۔ ذیل میں اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ کا مقصد تمویل (فنانسنگ) ہے نہ کہ حقیقی اجارہ:

✿ اسلامی بینکوں میں رائج معاملات جیسے اجارہ، مشارکہ متناقصہ وغیرہ سے بینک کی اصل غرض لوگوں کی مالی ضرورتیں پوری کر کے فائدہ اٹھانا ہے۔ حقیقی اجارہ یا شراکت کا ارادہ نہیں ہوتا۔ جہاں اجارہ اور شراکت کے نام پر صرف فنانسنگ کے ذریعے فائدہ حاصل کرنا مقصود ہو وہ معاملہ جائز نہیں ہوتا کیونکہ معاملات میں مقصد کو دیکھا جاتا ہے نہ کہ الفاظ کو چنانچہ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

((إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِءٍ مَا نَوٰى)) [صحيح بخاري : باب كيف كان بدء الوحى]

''اعمال نیتوں پر موقوف ہیں اور ہر شخص کے لیے وہی ہوگا جس کی اس نے نیت کی۔''

قانونِ اسلامی کا معروف قاعدہ ہے

((العبرة فى العقود للمقاصد والمعانى لا للالفاظ))

''عقود (Contracts) میں مقاصد اور معانی کا خیال رکھا جاتا ہے نہ کہ الفاظ کا''

عظیم محدث امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فعلم ان الا عتبار فى العقود والافعال بحقائقها ومقاصدها دون ظواهر الفاظها وافعالها)) [اعلام الموقعين: ج٣ ص ٢٨٠]

''معلوم ہوا کہ عقود اور افعال میں اصل اعتبار ان کے حقائق اور مقاصد کا ہے۔ ظاہری الفاظ اور افعال کا نہیں۔''

اسلامی بینکاری کے معروف سکالر ڈاکٹر رفیق یونس مصری لکھتے ہیں:

((لو ان هذين الاثنين اللذين اشتركا في ملكية العقار اتفقا منذ الاشتراك في العقار علىٰ ان يسدد احدهما اقساطا محددة ، يصبح مالكا بعد ها للعقار كله ،سواء كان خلال المدة مستاجرا لحصة شريكه او غير مستاجر لها ،فان هذا بنظر ى غير جائز وكذلك لو اتفقا قبل الدخول في شركة العقار ان يبيع احدهما للاخر حصته بيع تقسيط فهذا غير جائز لا لان بيع التقسيط غير جائز بل لانه شاركه علىٰ ان يبيعه فعرف ان المراد ليس هو الشركة ولا البيع ولاالايجار انما المراد هو التمويل ،ودخول البيع والا يجار عليه انما الغرض هو الوصول الىٰ فائدة من وراء هذا التمويل)) [المصارف الاسلاميه:ص ٤١]

''اگر یہ دونوں جو رئیل پراپرٹی کی ملکیت میں شراکت دار ہیں شروع ہی سے اس بات پر اتفاق کر لیں کہ ان میں سے ایک متعینہ اقساط ادا کر کے مکمل پراپرٹی کا مالک بن جائے گا خواہ دورانِ مدت شریک کے حصے کا کرایہ ادا کرے یا نہ ،تو میری نظر میں یہ معاملہ جائز نہیں۔اسی طرح اگر یہ دونوں رئیل پراپرٹی کی شراکت میں داخل ہونے سے پہلے اس پر متفق ہو جائیں کہ ان میں سے ایک اپنا حصہ قسطوں میں دوسرے کو بیچ دے گا یہ بھی جائز نہیں اس لیے نہیں کہ بیع قسط جائز نہیں بلکہ اس لیے کہ اس نے اس شرط پر شراکت داری کی ہے کہ وہ اپنا حصہ اسے فروخت کر دے گا تو اس سے معلوم ہوا کہ شرکت ،بیع اور اجارہ مقصود نہیں بلکہ مقصود تمویل ہے بیع اور اجارہ کو اس پر داخل کرنے کی غرض اس تمویل کے پردے میں فائدہ حاصل کرنا ہے''

شرح سود کو معیار بنانا:

❁ اسلامی بینک مرابحہ اور اجارہ وغیرہ کو جو اپنی اصل کے اعتبار سے طریقہ ہائے تمویل

(Modes of Financing) نہیں ہیں کو تمویلی سرگرمیوں کے لیے استعمال کرتے وقت اپنے نفع کا تعین شرح سود کے مطابق کرتے ہیں چنانچہ جامعہ دارالعلوم کراچی کے استاد اور اسلامی بینکاری کے سرگرم حامی جناب مولانا ڈاکٹر اعجاز احمد صمدانی لکھتے ہیں۔

''چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ حالات میں اسلامی بینک عام طور پر مروجہ بینکوں کے باہمی شرح سود کو معیار (Bench Mark) کے طور پر استعمال کرکے اپنے نفع یا کرایہ کا تعین کرتے ہیں جیسے پاکستان میں کائبور Kibor:(Karachi inter bank offered rate) سود کی وہ شرح جس پر کراچی کے بینک ایک دوسرے سے لین دین کرتے ہیں۔) کو معیار بنایا جاتا ہے اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ایسا کرنا جائز نہیں۔[اسلامی بینکاری، ایک حقیقت پسندانہ جائزہ:ص۵۲]

مولانا موصوف نے اس کو جواز بخشنے کے لیے جو تاویل کی ہے اس پر وہ خود بھی مطمئن نہیں یہی وجہ ہے کہ ایک صفحہ بعد ہی ''متبادل کی تلاش بھی کرنی چاہیے'' کا عنوان قائم کر دیا ہے۔ دوسری جگہ مرابحہ میں نفع کو کائبور کے ساتھ مربوط کرنے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اس صورت میں اس اعتبار سے تو عقد درست ہو جاتا ہے کہ بیچی گئی چیز کی قیمت متعین ہو جاتی ہے لیکن اس اعتبار سے اس میں ناپسندیدگی کا عنصر شامل ہو جاتا ہے کہ اس میں ایک شرح سود کو بطورِ بینچ مارک استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے اسلامی بینکوں کو چاہیے کہ کوئی اسلامی بینچ مارک تشکیل دیں تاکہ اس ناپسندیدگی کے عنصر کا بھی خاتمہ ہو سکے۔''[اسلامی بینکاری اور غرر:ص۵۶]

صمدانی صاحب کے استادِ گرامی مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب جو متعدد اسلامی بینکوں کی شرعی رہنمائی کا فرض سرانجام دے رہے ہیں روزنامہ امت کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''مثالی نظام مشارکہ اور مضاربہ معاشی انصاف فراہم کرسکتا ہے وہ وقت ابھی دور ہے کیونکہ مشارکہ اور مضاربہ کا استعمال Assests سائڈ پر بہت کم ہوتا ہے اور استعمال کم ہوئے پھر ان کی بنیاد پر Investment کم ہے لہٰذا اس کی جگہ ثانوی نوعیت کی

پراڈکٹ اجارہ، مرابحہ، Diminishing Musharaika وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ان میں مشکل یہ ہے کہ Bench mark وہی رہتا ہے جو سودی نظام میں ہے۔اس کے معانی یہ ہیں کہ آپ کو روپیہ ادھار دینے کی بجائے کتاب بیچ دی کہ چھ مہینے بعد دینا۔کتاب بیچی لیکن نفع Fix کر دیا اور ایک مخصوص مدت بعد وصولی کا معاہدہ کر لیا۔اس منافع کمانے کا بینچ مارک وہی ہے جو سودی نظام کا ہے اس لیے اسلامی نظام کے معاشرے پر جو اثرات ہونے چاہیے تھے وہ ابھی تک نہیں ہو رہے ہے۔'' [روزنامہ امت: ۴ دسمبر ۲۰۰۵ء ص ۵، ۷]

حضرتِ مفتی صاحب بجا فرماتے ہیں کہ اجارہ، مرابحہ ثانوی نوعیت کے پراڈکٹ ہیں اور معاشرے پر ان کے وہ اثرات بھی مرتب نہیں ہو رہے جو اسلامی نظام کے ہونے چاہیں۔تو کیا ہم یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتے ہیں کہ پھر اس کو وقت کی ضرورت قرار دے کر فتووں کے ذریعے اسلامی ثابت کرنے کی کوشش کیوں کی جا رہی ہے؟

اسلامی بینکوں کا طریقہ بھی سودی بینکوں جیسا ہے:

❁ مثلاً سودی بینک کھاتہ داروں کو متعین منافع دیتے ہیں جو سود کے زمرہ میں آتا ہے۔اسلامی بینک بھی یہی تأثر دیتے ہیں ثبوت کے لیے دیکھیے روزنامہ نوائے وقت ۳۰ جولائی ۲۰۰۸ صفحہ ۲ پر ایمیریٹس اسلامی بینک اور الفلاح اسلامی بینک کی طرف سے دیا گیا الگ الگ اشتہار۔ایمیریٹس اسلامی بینک نے اپنے اشتہار میں 11.75 فیصد سالانہ منافع کا لالچ دیا ہے البتہ سٹار لگا کر ایک جانب باریک سایہ بھی لکھ دیا ہے:

''پانچ سالہ ڈیپازٹس پر گذشتہ ماہ کا اعلان کردہ منافع۔''

جبکہ الفلاح اسلامی بینک نے تین سالہ ٹرم ڈیپازٹ پر 10.1 فیصد'' حلال منافع'' دینے کا وعدہ کیا ہے اور سٹار لگا کر باریک سایہ لکھ دیا ہے:

''یہ مذکورہ منافع جون ۲۰۰۸ء میں دیا گیا آئندہ مختلف ہو سکتا ہے۔''

یہ بٹارنگ دراصل مخالفین کو چپ کروانے کے لیے ہے۔ ورنہ حقیقت میں سودی بینکوں کی طرح پہلے سے متعین منافع دیا جاتا ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ الفلاح اسلامی بینک نے ۲۶ جولائی ۲۰۰۸ء کو اپنے ڈیپازیٹرز کو جولیٹر جاری کیا ہے اس میں سٹار کے بغیر صاف یہ لکھا ہے۔ ہمارے ہاں اکاؤنٹ کھلوا کر ہائی پرافٹ ریٹ حاصل کریں۔اور مختلف ٹرم کے لیے مختلف طے شدہ ریٹ مقرر کیے گے ہیں۔

❁ اگر آپ سودی بینک کے ساتھ لیز پر گاڑی لینے کا معاملہ کرتے ہیں تو بینک بکنگ کے لیے رقم جمع کروانے کی تاریخ سے ہی اپنا کرایہ وصول کرنا شروع کر دے گا خواہ آپ کو گاڑی تین ماہ بعد ملے کیوں؟

اس لیے کہ سودی نظام کا تقاضا ہے کہ جو رقم بینک کے کھاتے سے نکل گئی ہے بینک کو اس کا سود وصول ہو۔ کلائنٹ کو گاڑی کب ملتی ہے بینک کو اس سے غرض نہیں۔ اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ میں بھی یہی ہوتا ہے مگر اس ترمیم کے ساتھ کہ اسلامی بینک ان تین ماہ کا کرایہ گاڑی ملنے کے بعد اس طرح وصول کرتا ہے کہ یا تو اس کو تمام اقساط میں ایڈجسٹ کر دیتا ہے یا پہلی قسط زیادہ رکھ کر یکمشت وصول کر لیا جاتا ہے۔ثبوت کے لیے دیکھیے ماہر اسلامی بینکاری جناب محمد ایوب کی کتاب Undre standing Islamic Finance صفحہ:۲۹۶۔اسلامی بینک ان تین ماہ کا کرایہ سودی طریقہ کار کے تحت ہی لیتا ہے۔

تاخیر پر جرمانہ:

❁ سودی بینکوں کی طرح اسلامی بینک بھی ادائیگی میں تاخیر پر جرمانہ کرتے ہیں جو کہ اسلامی بینک کے زیرِ نگرانی قائم خیراتی فنڈ میں جمع کروایا جاتا ہے۔ یہاں بھی سودی فارمولا اختیار کیا جاتا ہے کہ ایک تو جرمانہ واجب الادا رقم کے تناسب سے عائد کیا جاتا ہے اور دوسرا تاخیر کی مدت بڑھنے کے ساتھ جرمانہ کی رقم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

شریعت میں تاخیر پر جرمانہ کا تصور نہیں ہے:

قرآن وحدیث میں تاخیر پر جرمانہ کا تصور موجود نہیں اور نہ ہی فقہاء اس کی اجازت

دیتے ہیں۔امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((لا یحل ذنب من الذنوب مال انسان و ان قتل نفسا))

[الطرق الحکمیة:ص۲٤۷]

''قتل سمیت کوئی گناہ انسان کے مال کو حلال نہیں کرتا۔''

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((انما العقوبة فی الابدان لا فی الاموال))[سنن بیھقی باب مایستدل به علیٰ ترك تضعیف الغرامة:ص۲۸۸]

''سزا صرف جسمانی ہے نہ کہ مالی۔''

فقہ حنبلی کی معروف کتاب المغنی میں ہے:

((والتعزیر یکون بالضرب والحبس والتوبیخ ولا یجوز قطع شیء منه ولا جرحه ولا اخذ ماله لان الشرع لم یرد بشیء من ذلك عن احد یقتدی به)) [ایضًا۔ ج۲۰، ص۳٦۹]

''تعزیر مارنے،قید کرنے اور ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے ہوتی ہے اس کا کوئی حصہ کاٹنا یا اسے زخمی کرنا یا اس کا مال لینا جائز نہیں کیونکہ جن لوگوں کی اقتداء کی جاتی ہے ان کے حوالے سے شریعت میں اس طرح کی کوئی چیز بیان نہیں ہوئی۔''

فقہاء حنفیہ کے نزدیک بھی مالی جرمانہ جائز نہیں۔چنانچہ علامہ ابن نجیم حنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((والحاصل ان المذهب عدم التعزیر بأخذ المال)) [البحر الرائق شرح کنز الدقائق :فصل فی التعزیر ج۱۳ص۱٦۸]

''خلاصہ کلام یہ ہے کہ حنفی مذہب کے مطابق مال لے کر تعزیری سزا جائز نہیں۔''

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں درمختار کے حوالے سے لکھا ہے:

((لا یاخذ المال فی المذهب)) [فتاویٰ دارالعلوم: ج۱۲، ص۲٥۲]

''حنفی مذہب کے مطابق مالی جرمانہ درست نہیں۔''

نیز اسی صفحہ کے آخر میں ہے کہ جرمانہ مالی شرعاً درست نہیں۔

امام حطاب رحمہ اللہ کے قول سے غلط استدلال:

اسلامی بینکوں کے بعض حامی جرمانہ کے حق میں امام حطاب رحمہ اللہ کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں۔

((اما اذا التزم المدعی علیه للمدعٰی انه ان لم یوفه حقه فی وقت کذا و کذا فله علیه کذا و کذا فهذا لا یختلف فی بطلانه لانه صریح الربا......الی قوله واما اذا التزم انه لم یوفه حقه فی وقت کذا فعلیه کذا لفلان او صدقة للمساکین فهذا هو محل الخلاف)) [اسلام اور جدید معیشت وتجارت: ص ۱۴۵، از تقی عثمانی بحوالہ تحریر الکلام فی مسائل الالتزام]

''جب مدعا علیہ مدعی کے لیے اپنے اوپر یہ لازم کرلے کہ اگر وہ اس کا فلاں وقت پر حق ادا نہیں کرے گا تو وہ اس کو اتنی رقم ادا کرے گا تو اس کے باطل ہونے میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ یہ صریح سود ہے اور جب یہ پابندی عائد کرلے کہ فلاں وقت اس کا حق ادا نہ کیا تو میں اتنے پیسے فلاں کو دوں گا یا مساکین پر صدقہ کروں گا تو اس کے جواز میں (قضاء) اختلاف ہے''

اگر غور کیا جائے تو امام حطاب رحمہ اللہ کے اس قول سے اسلامی بینکوں میں رائج مالی جرمانہ کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔

- ایک تو اس لیے کہ اسلامی بینکوں میں تاخیر پر جو جرمانہ وصول کیا جاتا ہے وہ واجب الادا رقم کے تناسب سے ہوتا ہے اور مدت بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ بھی ہوتا جاتا ہے جبکہ امام حطاب رحمہ اللہ کا یہ منشا قطعاً نہیں ہے۔
- دوسرا اس لیے کہ امام حطاب رحمہ اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ یہ کہے کہ میں اتنی رقم قرض خواہ

کو دوں گا یا اس کی وساطت سے صدقہ کروں گا بلکہ انہوں نے تو فرمایا ہے کہ مدیون (Debtor) یہ کہے کہ میں اتنی رقم فلاں کو یعنی کسی دوسرے کو دوں گا یا مساکین پر صدقہ کروں گا اسلامی بینکوں میں یہ شرط ہوتی ہے کہ وہ اتنا جرمانہ بینک کے زیر نگرانی قائم خیراتی فنڈ میں جمع کروائے گا۔

- تیسرا اس لیے کہ امام حطاب رحمۃ اللہ علیہ نے التزام کا لفظ بولا ہے جس کا مطلب ہے کہ مدیون اپنے ذمہ یہ لے نہ کہ دوسرا شخص یہ شرط لگائے۔ اس کے برعکس اسلامی بینکوں میں بینک کی طرف سے یہ شرط ہوتی ہے۔ اسلامی بینکاری کے حامی کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے شریعت میں تاخیر پر جرمانہ درست نہیں مگر چونکہ اس سے بینک کی آمدن میں اضافہ نہیں ہوتا اس لیے یہ جائز ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک بینک کی آمدن میں اضافہ نہیں ہوتا مگر مدیون کی جیب سے تو اتنی رقم نکل جاتی ہے شریعت کا یہ منشا تو ہرگز نہیں کہ قرض خواہ کی آمدن میں اضافہ ہو تو جرمانہ ناجائز ہے ورنہ جائز۔ اوپر فقہاء کے حوالے سے جو عبارتیں ہم نے نقل کی ہیں وہ بھی اس تاویل کو قبول کرنے سے اباء کر رہی ہیں۔

اسلامی بینک نان رسک ہیں:

- سودی بینکوں کی طرح اسلامی بینک بھی Non Risk ہیں۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ جب کوئی اسلامی بینک کے ساتھ مرابحہ یا اجارہ کا معاملہ کرنے جاتا ہے تو بینک اس سے اچھی خاصی رقم جو عام طور پر مطلوبہ چیز کی قیمت کا دس فیصد ہوتی ہے ٹوکن منی (حامش جدیہ) کے نام سے وصول کرتا ہے تاکہ اگر بعد میں وہ شخص چیز لینے سے انکار کر دے اور بینک کو وہ چیز دوسری جگہ قیمت لاگت سے کم پر فروخت کرنی پڑے تو بینک اس ٹوکن منی سے اپنا نقصان پورا کر سکے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کیا اسلامی بینکوں کے نزدیک یہ خطرہ مول لینا رسک میں شامل نہیں؟ ممکن ہے اسلامی بینکنگ کے محققین فرمائیں کہ ہمارے نزدیک اس قسم کے خطرے میں پڑنا رسک میں شامل

نہیں اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر دوسری جگہ بیچنے پر بینک کو فائدہ ہو گیا وہ یہ نفع خریداری کا آڈر دینے والے شخص کو دینے کے لیے تیار ہے؟ ظاہر ہے بینک اس پر تیار نہیں ہوگا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بینک نقصان اٹھانے کے لیے تیار نہیں تو نفع کس بنیاد پر لیتا ہے؟

اسلامی بینکاری کے حامیوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ بینک چونکہ تجارتی ادارہ نہیں اس لیے بینک کے لیے اس طرح کا خطرہ مول لینا ممکن نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو ان لوگوں کے موقف کی تائید ہے جو کہتے ہیں کہ بینک صرف کاغذوں کی حد تک کاروبار کرتا ہے عملاً اس کا کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسلامی بینکنگ کے حامی جس کو رسک قرار دیتے ہیں وہاں بھی بینک خود کو انشورنس کے ذریعے محفوظ رکھتا ہے اور انشورنس کی رقم بھی لاگت میں شمار کر کے کلائنٹ سے وصول کر لیتا ہے۔ یعنی رسک کی ساری ذمہ داری کلائنٹ کی ہے۔ اسلام میں حقیقی رسک اٹھائے بغیر نفع لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اسلامی بینکوں میں رائج طریقہ ہائے تمویل کی حقیقت:

علاوہ ازیں اسلامی بینکوں میں سرمایہ کاری اور لوگوں کی مالی ضرورتیں پوری کرنے کے جو طریقے مضاربہ، مرابحہ، مشارکہ، اجارہ اور بیع تورق رائج ہیں وہ اس سادہ صورت میں موجود نہیں جو کتب حدیث وفقہ میں بیان ہوئی ہیں۔ جیسا کہ ذیل کی تفصیل سے ثابت ہوتا ہے۔

مضاربہ:

اسلامی بینکوں میں زیادہ تر کھاتے مضاربہ کی بنیاد پر کھولے جاتے ہیں۔ مضاربہ کو قراض اور معاملہ بھی کہا جاتا ہے اس کا اطلاق کاروبار کی اس صورت پر ہوتا ہے جس میں ایک شخص جس کو رب المال (مال کا مالک) کہتے ہیں کا سرمایہ ہوتا ہے اور دوسرا شخص جس کو مضارب یا عامل کہا جاتا ہے اس سرمایہ کی بنیاد پر تجارت کرتا ہے۔ اس تجارت سے جو نفع

حاصل ہوتا ہے اس میں دونوں آپس میں طے شدہ تناسب سے شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((القراض والمضاربة ان يدفع اليه ما لا ليتجر فيه والربح مشترك)) [المنهاج: كتاب القراض ج١ ص٢٢٩]

''قراض اور مضاربہ کا یہ مطلب ہے کہ ایک شخص دوسرے کو مال دے تاکہ وہ اس میں تجارت کرلے اور نفع دونوں میں مشترک ہو''

نيل المآرب میں ہے:

((وهي شرعا ان يدفع انسان من ماله الى انسان آخر شيئاً او يكون له تحت يده على سبيل الوديعة او الغصب مال ويأذن له ليتجر فيه ويكون الربح بينهما بحسب ما يتفقان عليه))[نيل المآرب شرح دليل الطالب ص١٩٤]

''مضاربہ کا شرعی معنی یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کو اپنے مال میں سے کچھ دے یا اس کا مال پہلے ہی سے بطورِ امانت اس کے پاس پڑا ہو یا اس نے غصب کر رکھا ہو اور وہ اس کو اجازت دے دے کہ وہ اس میں تجارت کرے اور نفع ان دونوں کے درمیان اس تناسب سے ہوگا جس پر وہ متفق ہوں۔''

الملخص الفقهي میں مضاربہ کا مفہوم یوں بیان ہوا ہے:

((دفع مال معلوم لمن يتجربه ببعض ربحه))[ايضًا۔٢۔ص ٧١]

''نفع کے کچھ حصے کے بدلے مال اس شخص کے حوالے کرنا جو اس کو تجارت میں لگائے۔''

مضاربہ کی صورت میں اگر تجارت میں خسارہ ہو جائے تو اس کا ذمہ دار صرف رب المال ہوتا ہے۔ مضارب اس میں حصہ دار نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ وہ اپنی محنت کے ثمرہ سے محروم رہتا ہے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے:

((الوضیعة علی المال والربح علی ما اصطلحوا علیه))

[مصنف عبد الرزاق: ج۸ ص۲۴۸]

''خسارہ رب المال کا ہوگا اور نفع اس تناسب سے جس پر انہوں نے اتفاق کیا ہو۔''

مضارب کی حیثیت:

امام ابن قیم رحمہ اللہ کے نزدیک مضارب کی چار حیثیتیں ہیں:

(۱) امین (۲) اجیر (۳) وکیل (۴) شریک

وہ فرماتے ہیں کہ امین تو وہ اس اعتبار سے ہے کہ مال اس کے قبضہ میں ہے اور مال میں تصرف کے اعتبار سے وہ وکیل ہے (مال کے مالک کا نمائندہ) اور عملی اعتبار سے اجیر ہے جب اس مال میں نفع حاصل ہو جائے تو تب وہ شریک ہوگا۔[الملخص الفقهی: ج۲ ص۷۱]

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں جو مال مضارب کے حوالے کیا گیا ہے وہ اس کے پاس امانت ہے اور وہ اس میں وکیل بھی ہے کیونکہ وہ مال کے مالک کے حکم سے تصرف کرتا ہے جب فائدہ ہو تب وہ شریک بن جاتا ہے کیونکہ اپنے عمل کی بدولت مال کے ایک حصے کا مالک بن چکا ہے۔[هدایه مع البنایه: ج۱۰ ص۴۴،۴۵]

مضاربہ کی شرطیں:

مضاربہ میں جن شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے ان میں سے ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ نفع میں فریقین میں سے ہر ایک کے حصہ کا تناسب پہلے سے طے ہو مثلاً نفع رب المال اور مضارب میں برابر تقسیم ہوگا یا رب المال نفع کے ساٹھ فیصد اور مضارب چالیس فیصد کا حقدار ہوگا کیونکہ مضاربہ میں اصل عقد منافع پر ہوتا ہے اگر یہ مجہول ہو تو مضاربہ فاسدہ ہو جائے گا۔ جیسا کہ بدائع الصنائع ج۱۳ ص۱۷۱ میں ہے۔ امام مالک کے نزدیک نفع کی تقسیم کے وقت رب المال کا موقع پر موجود ہونا بھی ضروری ہے چنانچہ مؤطا میں ہے:

((قال مالك: فی رجل دفع الی رجل مالا قراضا فعمل به فربح فارادا ان یاخذ حصته من الربح وصاحب المال غائب قال

لا ینبغی له ان یاخذ منه شیئا الا بحضرة صاحب المال))

[کتاب القراض: باب المحاسبه فی القراض]

''اس شخص کے بارے میں جو دوسرے کو مضاربہ کی بنیاد پر مال دیتا ہے وہ اسے کام میں لاکر نفع حاصل کرتا ہے اب وہ یہ چاہتا ہے کہ رب المال کی غیر موجودگی میں ہی نفع سے اپنا حصہ لے لے امام مالک نے فرمایا جب تک مال کا مالک موجود نہ ہو اس کو یہ حق نہیں پہنچتا۔''

اسی طرح اگر کسی آدمی نے دوسرے کو مضاربہ کی بنیاد پر مال دیا اس نے تجارت کے ذریعے نفع کمایا پھر راس المال کو الگ کر کے نفع سے اپنا حصہ لے لیا اور رب المال کا حصہ گواہوں کی موجودگی پر مال میں شامل کر دیا، امام مالک فرماتے ہیں کہ جب تک مال کا مالک موجود نہ ہو نفع تقسیم کرنا درست نہیں۔ اگر مضارب نے ازخود کوئی چیز لی ہو تو وہ اسے واپس کرے حتیٰ کہ مال کا مالک اپنا مال وصول پالے پھر جو باقی بچے اس کو دونوں آپس میں تقسیم کرلیں۔ [حوالہ مذکورہ]

امام مالک رحمہ اللہ کی بات ہر لحاظ سے عقلی میزان پر پورا اترتی ہے اس لیے کوئی دانشور اس سے اختلاف نہیں کرسکتا۔ بات تو سیدھی سی ہے کہ جب رب المال اور مضارب دونوں نفع میں شریک ہیں تو کیا اس کا فرض نہیں کہ وہ رب المال کو اعتماد میں لے اور بتائے کہ میں نے یہ کاروبار کیا اتنے اخراجات آئے باقی یہ نفع ہے نہ کہ باقی سب فیصلے خود ہی کرلے۔

مضاربہ کا میدان:

اکثر فقہاء کے نزدیک مضاربہ کا مال تجارتی سرگرمیوں کے علاوہ استعمال نہیں کیا جاسکتا چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((عقد القراض یقتضی تصرف العامل فی المال بالبیع والشراء، فإذا قارضه علی أن یشتری به نخلا یمسك رقابها ویطلب ثمارها لم یجز لانه قید تصرفه الکامل بالبیع والشراء، ولان

القراض مختص بما یکون النماء فیه نتیجة البیع والشراء وهو فی النخل نتیجة عن غیر بیع وشراء فبطل أن یکون قراضا ولا یکون مساقاة، لانه عاقده علی جهالة بها قبل وجود ملکها، وهکذا لو قارضه علی شراء دواب أو مواشی یحبس رقابها ویطلب نتاجها لم یجز لما ذکرنا)) [المجموع: ج۱٤ ص۳۷۱]

''عقد مضاربہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ مضارب مال میں خرید وفروخت کے ذریعے تصرف کرے چنانچہ جب وہ اس طرح مضاربہ کرے کہ وہ اس مال سے کھجوروں کے درخت خریدیگا اوران سے پھل حاصل کرے گا تو یہ جائز نہیں کیونکہ قید یہ ہے کہ کامل تصرف خرید وفروخت کے ذریعے ہو اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مضاربہ ان معاملات کے ساتھ مختص ہے جہاں مال میں اضافہ خرید وفروخت کے نتیجے میں ہو جبکہ کھجوروں میں یہ اضافہ خرید وفروخت کے نتیجے میں نہیں اس لیے اس کا مضاربہ باطل ٹھہرا اور یہ مساقات کا معاملہ بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ اس صورت میں یہ کھجوروں کی ملکیت وجود میں آنے سے پہلے مجہول درختوں پر عقد ہوگا اسی طرح اگر اس طرح مضاربہ کرلے کہ وہ جانور یا مویشی خریدے گا جو بذات خود تو اس کے پاس محفوظ ہونگے مگر ان کی پیداوار حاصل کرے گا تو یہ بھی جائز نہیں وجہ وہی ہے جو ہم نے اوپر ذکر کی ہے یعنی یہ نفع خرید وفروخت کے نتیجے میں حاصل نہیں ہوا۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

((لو قارضه علی أن یشتری الحنطة فیطحنها ویخبزها والطعام لیطبخه ویبیعه والغزال لینسجه والثوب أو لیقصده والدبغ بینهما فهو فاسد......قارضه علی دراهم علی أن یشتری نخیلا أو دواب أو مستغلات ویمسك رقابها لثمارها ونتاجها وغلاتها وتکون الفوائد بینهما فهو فاسد لأنه لیس ربحاً بالتجارة بل من عین المال))[روضة الطالبین: ج۲، ص۱۸۸]

''اس کا مطلب یہی ہے کہ مضاربہ کا مال تجارتی سرگرمیوں کے علاوہ دوسری پیداواروں سکیموں میں استعمال نہیں ہوسکتا جیسے کوئی اس بات پر مضاربہ کرلے کہ وہ گندم خرید کر اسے بیچے گا یا اور نفع دونوں میں تقسیم ہوگا تو یہ مضاربہ فاسدہ ہوگا کیونکہ یہ نفع تجارت کے ذریعے حاصل نہیں ہوا بلکہ خود مال سے جنم لیا ہے''

امام ابوالقاسم عبدالکریم الرافعی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((لو قارضه على ان يشترى الحنطة فيطبحها و يختبرها و الطعام ليطبحه و يبيع و الربح بينهما فهو فاسد ان الطبح و الخبر و نحوهما اعمال مضبوطة يمكن الاستئجار عليها و ما يمكن الاستئجار عليه فلسيغنى عن الفرائض انما القراض لما لا يجوز الاستئجار عليه وهو التجارة التى لا ينضبط قدرها)) [فتح القدير شرح الوجيز: ج ۱۲ ص ۱۱]

''یعنی مضاربہ کے مال سے صرف تجارت کی جاسکتی ہے دوسرے نفع بخش کاموں میں لگانے کی اجازت نہیں کیونکہ مضاربہ وہاں ہوتا ہے جہاں اجارہ نہ ہوسکے اور وہ تجارت ہے جہاں اجارہ ہوسکے وہاں مضاربہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔''

فقہاء حنفیہ کے نزدیک بھی مضاربہ کا مال صرف تجارت اور اس سے متعلقہ سرگرمیوں میں ہی لگایا جاسکتا ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے:

((فينتظم العقد صنوف التجارة و ما هو من صنيع التجار))

[هدايه مع البنايه: ج ۱۰ ص ۵۲]

دوسری جگہ ایک مسئلہ کی وضاحت میں لکھتے ہیں کہ یہ امام محمد اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ کے نزدیک اس لیے جائز نہیں کہ یہ تجارت میں شامل نہیں اور عقد مضاربہ کا مقصد صرف تجارت میں کسی کو ایجنٹ بنانا ہے مزید لکھتے ہیں کہ ''جب یہ تجارت نہیں تو مضاربہ میں بھی شامل نہیں۔'' [هدايه مع البنايه: ج ۱۰ ص ۸۷]

علامہ زکریا انصاری رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

((لَوْ قَارَضَهُ عَلَى أَنْ يَشْتَرِيَ بِالدَّرَاهِمِ نَخْلًا لِيَسْتَغِلَّهُ ، وَالرِّبْحُ بَيْنَهُمَا ؛ لِأَنَّ مَا حَصَلَ لَيْسَ بِتَصَرُّفِ الْعَامِلِ ، وَإِنَّمَا هُوَ مِنْ عَيْنِ الْمَالِ))[البهجة الوردية :باب القراض ج١١ ص ٤٨٠]

"اگر کوئی یوں مضاربہ کرلے کہ وہ درہموں سے کھجوروں کے درخت خریدے گا تاکہ ان کی آمدن حاصل کرے اور نفع دونوں کے درمیان تقسیم ہوگا تو یہ بھی جائز نہیں کیونکہ اس صورت میں جو نفع حاصل ہوا ہے وہ مضاربہ کے تصرف کا نتیجہ ہے وہ تو مال کا اپنا حصہ ہے۔"

مذکورہ بالا عبارتیں اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ ان جلیل القدر فقہاء کے نزدیک مضاربہ کا مال تجارتی سرگرمیوں کے علاوہ دوسرے نفع بخش منصوبوں میں استعمال نہیں ہوسکتا۔

ایک تو اس لیے کہ دوسرے منصوبوں کے ذریعے جو فائدہ حاصل ہوگا وہ مضارب کی محنت کی بجائے خود مال کا نتیجہ ہوگا۔جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ اور علامہ زکریا انصاری رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔

اور دوسرا اس لیے کہ مضاربہ صرف اس چیز میں ہوتا ہے جو غیر منضبط ہو اور وہ صرف تجارت ہے۔جہاں اجارہ ہوسکے وہاں مضاربہ کی ضرورت نہیں ہوتی جیسا کہ امام عبدالکریم الرافعی نے ذکر کیا ہے۔

چونکہ دلائل کے اعتبار سے یہ نقطہ نظر قوی ہے اس لیے اسلامی بینکاری کے حامی بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ بنیادی طور پر مضاربہ تجارت میں ہی ہوتا ہے۔دوسرے زرعی اور صنعتی منصوبوں میں اس کا استعمال اس کے مفہوم میں وسعت پیدا کر کے کیا جانے لگا ہے چنانچہ عالمی سطح پر اسلامی بینکوں کی شرعی رہنمائی کے لیے قائم تنظیم "هيئة المحاسبة والمراجعة للمئوسسات المالية الاسلامية" Accounting And Auditing Organization for Islamic Financial Institutions (مخفف:AAOFI) کے شائع کردہ المعايير الشرعية میں ہے۔

((والمضاربة من الصيغ التي تستخدم غالبا في التجارة ثم توسعت استخداماتها حتى شملت مجالات الاستثمار التجارية والزراعية والصناعية والخدمية وغيرها)) [ایضاً۔ص ۲۳۲]

''مضاربہ ان طریقوں میں سے ہے جو زیادہ تر تجارت میں استعمال کیا جاتا ہے پھر اس کے استعمال میں وسعت پیدا ہوگی یہاں تک کہ تجارتی، زرعی اور صنعتی سرمایہ کاری وغیرہ کو بھی شامل ہوگیا۔''

مضاربہ کے مفہوم میں یہ وسعت کس نے پیدا کی کب کی اور کس بنیاد پر کی؟ ہمیں پورا یقین ہے کہ اسلامی بینکنگ کے حامیوں کے پاس اس کا کوئی ایسا جواب نہیں ہے جو اہل علم کو مطمئن کر سکے یہی وجہ ہے کہ المعايير الشرعية کے قابل احترام علماء کرام نے اس کے متعلق اس سے زیادہ لب کشائی نہیں فرمائی۔

اسلامی بینکوں میں رائج مضاربہ کی حقیقت:

اگر اسلامی بینکاری کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ اسلامی بینکوں میں رائج مضاربہ میں اوپر بیان کردہ اصولوں اور شرطوں کا پوری طرح خیال نہیں رکھا جاتا اور نہ ہی یہ عدل وانصاف پر مبنی ہے۔اسکی وضاحت کے لیے ذیل کی سطور ملاحظہ فرمائیں۔

❁ اگرچہ اسلامی بینکوں میں یہ سہولت موجود ہے کہ اگر کوئی ڈیپازیٹر یہ جاننا چاہے کہ نفع کی تقسیم کس تناسب سے ہوگی تو متعلقہ بینک کے ذمہ دار بتانے کے پابند ہیں یا وہ خود بھی بینک کی ویب سائٹ پر دیکھ سکتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی ہوتا ہے کہ ڈیپازیٹر سے جو فارم پر کروایا جاتا ہے اس میں صاف لکھا ہوتا ہے کہ بینک یہ تناسب تبدیل کرنے کا بھی مجاز ہے تاہم اس صورت میں بینک کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ تبدیل شدہ تناسب اپنی ویب سائٹ پر جاری کرے یا لکھ کر نوٹس بورڈ پر آویزاں کرے۔اب یہ تبدیل شدہ تناسب کتنی مدت کے لیے ہوگا اس کا ذکر نہیں ہوتا اس سے یہ معاملہ ناجائز ہو

جاتا ہے۔اسلامی بینکنگ کے مؤیدین بھی اس بات کے قائل ہیں کہ یہ صراحت ہونی چاہیے کہ نفع کی تقسیم کا یہ فارمولا کب تک چلے گا۔[دیکھیے :المعاییر الشرعیۃ ص:۲۲٤]

❁ اسلامی بینکوں میں نفع کی تقسیم کے لیے رقم کی کمی بیشی کی بنیاد پر ڈیپازیٹر کی رقوم کا الگ الگ وزن مقرر کیا جاتا ہے جس کی رقم زیادہ ہو اس کا وزن زیادہ رکھا جاتا ہے اور جس کی رقم تھوڑی ہو اس کا کم۔مثلاً میزان بینک کی ویب سائٹ سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق ماہِ اپریل 2008ء کا ویٹج اسائنڈ یوں ہے:اگر رقم 10,000 سے لیکر ایک لاکھ سے کم تک ہو تو ویٹج اسائنڈ 0.31 ہوگا اور اگر رقم ایک لاکھ سے لیکر 0.99 ملین تک ہو تو ویٹج اسائنڈ 0.36 تک ہوگا۔گویا اسلامی بینکوں میں کم رقم رکھوانا جرم ہے جس کی سزا یہ ہے کہ اس کی رقم کا وزن کم رکھا جائے۔ویٹج اسائنڈ کو رقم کی کمی بیشی سے مربوط کرنا عدل کے خلاف ہے۔۱۹۸۷ء میں خود اسٹیٹ بینک اسکو غلط کہہ چکا ہے۔دیکھیے B-C-D کا جاری کردہ سرکولر نمبر 6 بتاریخ 1987-7-12۔

یہاں ایک اور زیادتی بھی کی جاتی ہے وہ یہ کہ مضاربہ میں بینک کی اپنی رقم بھی ہوتی ہے بینک اس کا ویٹج اسائنڈ ڈیپازیٹر سے مختلف رکھتا ہے۔مثلاً اسی ماہ اپریل میزان بینک نے اپنی رقم کا ویٹج اسائنڈ 1.7 رکھا ہے۔یہ فرق خود اس اصول کے بھی خلاف ہے وہ اس طرح کہ اگر بینک نے مثلاً مضاربہ میں ایک ارب روپیہ لگایا ہے اور اس میں نوے کروڑ کھاتہ دار کا اور دس کروڑ بینک کا تو اس اصول کے مطابق کھاتہ داروں کے ویٹج اسائنڈ بینک کی رقم سے زیادہ ہو جانا چاہیے۔کیونکہ مجموعی اعتبار سے کھاتہ داروں کی رقم زیادہ ہے لیکن بینک نے الٹا اپنی رقم کا ویٹج اسائنڈ زیادہ رکھا ہوتا ہے۔ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ جب اسٹیٹ بینک نے ۱۹۸۷ء میں اس سے روک دیا تھا پھر اسلامی بینک ایسا کیوں کر رہے ہیں؟اس کا جواب یہ ہے کہ بعد میں جب کچھ وجوہ کی بنا پر یہ پابندی اٹھالی گئی تو اسلامی بینکوں نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا مگر سوال یہ ہے کہ کیا اسٹیٹ بینک کی پابندی ختم ہونے سے ایک غلط کام جائز ہو جاتا ہے اگر یہ اصول درست ہے تو بینک

اور کھاتہ دار دونوں کے لیے یکساں ہونا چاہیے۔

❁ اسلامی بینکوں میں رائج مضاربہ میں تیسری خرابی یہ ہے کہ ڈیپازیٹر بینک کا شریک ہے۔اس ناطے بینک پر لازم ہے کہ اس کو اعتماد میں لے جس طرح بینک اپنے شیئر ہولڈرز کے ساتھ معاملہ کرتا ہے اور بورڈ آف ڈرائریکٹر شیئر ہولڈرز کی نمائندگی کرتا ہے۔ بینک سے متعلقہ ہر چیز اس کے علم میں ہوتی ہے۔اس کے برعکس ڈیپازیٹر کو کوئی علم نہیں ہوتا کہ بینک کیا کر رہا ہے اور کتنا نفع ہوا ہے جو بینک دے دے کھاتہ دار پر اس کو قبول کرنا فرض ہوتا ہے۔اسلامی بینکوں کے فارمز میں بھی یہ درج ہوتا ہے کہ بینک نے جو نفع تقسیم کر دیا ڈیپازیٹر اس کو قبول کرنے کا پابند ہوگا کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہوگا۔ہم اسلامی بینکاری کے حامیوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ شرط قرین انصاف ہے؟

اسلامی بینکاری کے سکالر ڈاکٹر رفیق یونس مصری اسلامی بینکنگ میں حائل موانع اور مشکلات ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((الا ان المودعین یشکون من صعوبة اخری هی انهم شرکاء فیما بینهم بالمال ولکنهم مشتتون لا تجمعهم ای جمعیة او هیئة لحمایة مصالحهم حیال المساهمین فی المصرف الذین تجمعهم جمعیة عمومیة ویمثلهم مجلس ادارة))[المصارف الاسلامیه: ص۲۵]

''بلاشبہ ڈیپازیٹر ایک اور مشکل کا شکوہ کرتے ہیں وہ یہ کہ وہ مال کے ساتھ بینک کے شریک ہیں لیکن بینک میں حصہ دار جنکی نمائندگی بورڈ آف ڈرائیکٹرز کر رہا ہوتا ہے کے مقابلے میں ان کے مفادات کے تحفظ کے لیے کوئی تنظیم یا بورڈ نہیں۔''

❁ چوتھی بڑی خرابی یہ ہے کہ اسلامی بینک فقہاء کی اکثریت کے نقطہ نظر کے مطابق مضاربہ کا مال صرف تجارت میں ہی نہیں لگاتے بلکہ دوسرے منصوبوں پر بھی لگاتے ہیں۔

مرابحہ:

مروجہ اسلامی بینکوں نے فنانسنگ کے جو مختلف طریقے متعارف کرائے ہیں ان میں سرفہرست مرابحہ ہے۔ جس کو اسلامی بینکنگ کے نام پر وسیع پیمانے پر فروغ حاصل ہوا ہے۔ بیع مرابحہ کا مفہوم یہ ہے کہ فروخت کنندہ کوئی چیز اس وضاحت کے ساتھ بیچے کہ میں نے یہ اتنے میں خریدی ہے اور اب اتنے منافع کے ساتھ فلاں قیمت پر تمہیں فروخت کرتا ہوں۔

چنانچہ علامہ موفق الدین ابی محمد عبداللہ بن احمد بن محمد قدامہ حنبلی مقدسی فرماتے ہیں:

((مَعْنَى بَيْعِ الْمُرَابَحَةِ ، هُوَ الْبَيْعُ بِرَأْسِ الْمَالِ وَرِبْحٍ مَعْلُومٍ ، وَيُشْتَرَطُ عِلْمُهُمَا بِرَأْسِ الْمَالِ فَيَقُولُ رَأْسُ مَالِيْ فِيْهِ أَوْ هُوَ عَلَيَّ بِمِائَةٍ بِعْتُكَ بِهَا ، وَرِبْحُ عَشَرَةٍ)) [المغنی:٦ص، ٢٦٦]

''مرابحہ کا معنی ہے اصل لاگت اور متعین نفع کے ساتھ فروخت کرنا اس میں ضرور ہے کہ فروخت کنندہ اور مشتری کو اصل لاگت معلوم ہو، چنانچہ بیچنے والا کہے کہ اس میں میرا اصل سرمایہ مجھے یہ ایک سو کی پڑی ہے میں آپ کو دس نفع لے کر اتنے میں بیچتا ہوں۔''

لغت کی مشہور کتاب ''المعجم الوسیط ''میں ہے:

((هو بيع برأس المال مع زيادة معلومة))

اصل قیمت پر متعین نفع کے ساتھ فروخت کرنا بیع مرابحہ ہے۔ عام بیع اور مرابحہ میں یہ فرق ہے کہ عام بیع میں چیز کی اصل قیمت اور اپنا نفع بتانا ضروری نہیں ہوتا جبکہ مرابحہ میں مشتری کو اصل قیمت سے آگاہ کرنا لازمی شرط ہے۔

مرابحہ کی ضرورت اور اس کے بنیادی اصول:

مرابحہ ایک تمدنی اور معاشرتی ضرورت ہے کیونکہ ہر آدمی میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ کسی چیز کو اس کی اصل قیمت پر مناسب نفع کے بدلے خرید سکے بعض دفعہ تو فروخت کنندہ اصل قیمت سے بھی کئی گنا زیادہ نفع مانگ لیتا ہے۔ اس بناء پر انسان سوچتا ہے کہ کوئی

ایسا شخص مل جائے جو اپنی لاگت پر معقول نفع لے کر بیچنے پر تیار ہو۔ اس لحاظ سے بیع مرابحہ کی بنیاد امانت داری پر ہے لہٰذا اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ یہ ہر قسم کی خیانت اور غلط بیانی سے مبرا ہو اور مشتری کو اصل قیمت کا علم ہو جیسا کہ ''الموسوعة الفقية الكويتية'' میں ہے۔

((يشترط ان يكون الثمن الاول معلوما للمشترى الثانى لان العلم بالثمن شرط فى صحة البيوع فاذا لم يعلم الثمن الاول فسد العقد))

''اس میں یہ شرط ہے کہ مشتری ثانی کو پہلی قیمت کا علم ہو۔ کیونکہ بیوع کے صحیح ہونے کے لیے قیمت کا علم شرط ہے۔ جب پہلی قیمت کا علم نہیں ہوگا تو عقد فاسد ہو جائے گا۔''

مرابحہ کی مختلف قسمیں اور ان کا شرعی حکم:

نفع کے تعین کے اعتبار سے مرابحہ کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ پوری قیمت پر نفع کی ایک مخصوص مقدار مقرر کر لی جائے۔ مثلاً یوں کہا جائے کہ اس قیمت سے اتنے روپے زائد میں بیچتا ہوں یہ صورت سب کے نزدیک جائز ہے۔

چنانچہ علامہ موفق الدین ابی محمد عبداللہ بن احمد بن محمد قدامہ حنبلی مقدسی رقم طراز ہیں:

((فَهٰذَا جَائِزٌ لَا خِلَافَ فِىْ صِحَّتِهِ ، وَلَا نَعْلَمُ فِيْهِ عِنْدَ أَحَدٍ كَرَاهَةً))[المغنی:٦ ص٢٦٦]

''یہ جائز ہے کہ اس کے صحیح ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہمیں نہیں علم کہ اس کے متعلق کسی سے کراہت منقول ہو۔''

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نفع کا ایک خاص تناسب طے کر لیا جائے مثلاً یوں کہا جائے کہ اصل قیمت پر اتنے فیصد زائد نفع وصول کروں گا۔ صحابہ اور فقہاء کے ہاں یہ صورت بیع دہ یازدہ'' یا'' دہ دوازدہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس چیز میں میرا اصل سرمایہ اتنے روپے ہے اور میں ہر دس کے بدلے ایک روپیہ یا ہر دس کے بدلے

دو روپے نفع لوں گا اس کے جواز میں اختلاف ہے۔

قاضی شریح سعید بن مسیّب اور ابراہیم نخعی اس کے جائز ہونے کے قائل ہیں۔ چنانچہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں:

((عن شريح وسعيد بن المسيب وابراهيم النخعي انهم كانوا يجيزون بيع ده دوازده)) [السنن الكبرىٰ: كتاب البيوع، باب المرابحه]

''شریح سعید بن مسیّب اور ابراہیم نخعی بیع دہ دوازدہ جائز قرار دیتے ہیں۔''

امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے:

((لا باس بيع ده دوازده)) [مصنف عبدالرزاق: كتاب البيوع، باب بيع ده دوازده]

''بیع دہ دوازدہ میں کوئی حرج نہیں۔''

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

((لَا بَأْسَ الْعَشَرَةُ بِأَحَدَ عَشَرَ ، وَيَأْخُذُ لِلنَّفَقَةِ رِبْحًا)) [صحيح بخاري: كتاب البيوع، باب من اجرى الامصار على ما يتعارفون بينهم في البيوع والاجارة]

''اس میں کوئی حرج نہیں کہ دس کو گیارہ کے بدلے بیچے اور اخراجات پر بھی نفع وصول کریں۔''

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

((أَيْ لَا بَأْسَ أَنْ يَبِيعَ مَا اشْتَرَاهُ بِمِائَةِ دِينَارٍ مَثَلًا كُلُّ عَشَرَةٍ مِنْهُ بِأَحَدَ عَشَرَ فَيَكُونُ رَأْسُ الْمَالِ عَشَرَةً وَالرِّبْحُ دِينَارًا)) [فتح الباری: ج ٤ ص ٥١٣]

''یعنی اس میں کوئی حرج نہیں کہ جو چیز سو دینار کی خریدی ہے وہ اس طرح بیچے کہ ہر دس کے بدلے گیارہ دینار لوں گا تو اصل مال دس دینار ہوئے اور ایک دینار نفع۔''

امام ثوری رحمہ اللہ امام شافعی رحمہ اللہ اہل الرائے اور ابن منذر کی رائے میں بھی یہ جائز ہے۔[المغنی:٦ص٢٦٦]

اس کے برعکس حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے میں مرابحہ کی یہ صورت ناجائز ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

((بیع دہ دوازدہ ربا)) [مصنف عبدالرزاق: کتاب البیوع، باب بیع دہ دوازدہ]

''بیع دہ دوازدہ سود ہے۔''

اور عبداللہ بن ابی یزید کہتے ہیں:

((سمعت ابن عباس یکرہ بیع دہ دوازدہ قال وذاك بیع الاعاجم)) [السنن الکبریٰ للبیھقی و مصنف عبدالرزاق: کتاب البیوع، باب المرابحۃ]

''میں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سنا کہ وہ بیع دہ دوازدہ کو مکروہ سمجھتے تھے فرماتے تھے یہ عجمیوں کی بیع ہے۔ امام احمد نے بھی اس کو مکروہ کہا ہے اور امام اسحاق بن راہویہ کے خیال میں بھی یہ ناجائز ہے۔''

راجح رائے:

اگر فریقین کے دلائل کا موازنہ کیا جائے تو حسب ذیل وجوہ کے باعث ان بزرگوں کی رائے راجح معلوم ہوتی ہے جو اس کے حق میں ہیں۔

- قرآن وحدیث میں کوئی ایسی نص نہیں جو اس کی حرمت پر دلالت کرتی ہو۔ نیز اس سے کسی شرعی ضابطے کی خلاف ورزی بھی نہیں ہوتی۔
- پہلی قسم کی طرح اس میں بھی ہر چیز واضح ہے اصل لاگت بھی معلوم ہوتی ہے اور نفع بھی متعین ہے۔
- جہاں تک عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے آثار کا تعلق ہے ان کے

بارہ میں امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

((وھذا یحتمل ان یکون انمانھی عنه إذا قال ھو لك بده یازده أو قال بده دوازده لم یسم راس المال ثم سماه عند النقد وکذلك ما روی عن ابن عمر فی ذلك)) [السنن الکبریٰ : کتاب البیوع،باب المرابحة]

''اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ممانعت تب ثابت ہے جب یہ کہے کہ یہ چیز میں تجھے اس طرح فروخت کرتا ہوں کہ ہر دس کے بدلے ایک یا ہر دس کے بدلے دو نفع لوں گا۔اصل لاگت کا تذکرہ نہ کرے۔''

· پھر ادائیگی کے وقت اس کی وضاحت کرے۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کا بھی یہی مطلب ہے۔یاد رہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اثر سنداً بھی ثابت نہیں کیونکہ اس کو سفیان بن عیینہ صیغہ عن سے بیان کررہے ہیں اور وہ مدلس ہیں۔

مرابحہ میں ضمنی اخراجات کا حکم:

یہاں یہ امر بھی قابل ملاحظہ ہے کہ بیچی جانے والی چیز پر جو اخراجات آتے ہیں فروخت کنندہ ان کو بھی اصل لاگت میں شامل کرکے مجموعی لاگت پر نفع حاصل کرے گا۔اوپر صحیح بخاری کے حوالے سے حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ فروخت کنندہ اخراجات پر بھی نفع لے سکتا ہے۔شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

((للبائع ان یحسب فی المرابحة جمیع ما صرفه ویقول قام علی بکذا)) [فتح الباری:٤ ص ٥١٣]

''مرابحہ میں بائع کو یہ بھی حق ہے کہ وہ تمام اخراجات کو شمار کر کے یہ کہے کہ یہ مجھے اتنے کی پڑی ہے۔''

بیع مرابحہ اور بینکاری:

مذکورہ بالا تفصیل سے مرابحہ کا شرعی تصور اور اس کے اصول ومبادی نکھر کر سامنے آگئے

ہیں اور یہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ اس کا بینکاری کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ اسلامی بینکاری کے حامی مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''یہ اصطلاح آج کل معاشی حلقوں میں ایک بینکاری کے طریقے کے طور پر مروج ہے۔ جبکہ مرابحہ کا اصل تصور اس خیال سے مختلف ہے۔ مرابحہ اصل میں اسلامی فقہ کی ایک اصطلاح ہے اور اس سے مراد ایک قسم کی بیع ہوتی ہے۔ جس کا اپنے اصل تصور کے اعتبار سے تمویل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔'' [اسلامی بینکاری کی بنیادیں: ص۹۶]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''بنیادی طور پر مرابحہ طریقہ تمویل نہیں بلکہ بیع کی ایک خاص قسم ہے۔ شریعت کی رو سے تمویل کے مثالی طریقے ''مشارکہ'' اور ''مضاربہ'' ہیں۔''

آگے چل کے لکھتے ہیں:

''یہ بات کسی صورت نظر انداز نہیں ہونی چاہیے کہ مرابحہ اصل کے اعتبار سے طریقہ تمویل نہیں۔ یہ تو صرف سود سے بچنے کا ایک وسیلہ اور حیلہ ہے۔ ایسا مثالی ذریعہ تمویل نہیں جو اسلام کے معاشی مقصد کی تکمیل کرتا ہو۔'' [اسلامی بینکاری کی بنیادیں: ۱۰۸]

اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ:

اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ اصل میں ''المرابحة للآمر بالشراء یا المرابحة للواعد بالشراء'' ہے۔ یعنی خریداری کا آرڈر دینے یا خریداری کا وعدہ کرنے والے کے ساتھ مرابحہ کا معاملہ کرنا اس کو مرابحہ مرکبہ بھی کہتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کلائنٹ بینک سے درخواست کرتا ہے کہ آپ میرے لیے اس کوالٹی کی فلاں فلاں چیز خرید لیں میں وہ مرابحہ کی بنیاد پر آپ سے خرید لوں گا۔ شرح منافع کا تعین پہلے ہی ہو جاتا ہے۔ اور اس کا تعین شرح سود سے کیا جاتا ہے۔ عام طور پر بینک کلائنٹ کی دلچسپی جانچنے کے لیے ٹوکن منی (الہامش الجدی) بھی وصول کرتا ہے پھر جب بینک حسب وعدہ مطلوبہ سامان خرید لیتا ہے تو باقاعدہ بیع کے ذریعے کلائنٹ کو فروخت کرتا ہے اور کلائنٹ عموماً

اپنے وعدے کے مطابق خریدنے کا پابند ہوتا ہے بعض دفعہ بینک پر بھی وعدے کی پابندی لازم ہوتی ہے لیکن عام طور پر بینک آزاد ہی ہوتا ہے۔ اگر بینک کے سامان خریدنے کے بعد کلائنٹ حسب وعدہ خریدنے سے انکار کر دے تو بینک وہ سامان کسی دوسرے کو بیچ دیتا ہے اور اصل لاگت سے جتنا خسارہ ہوتا ہے وہ وعدہ کرنے والے سے وصول کرتا ہے بینک چونکہ تجارتی ادارہ نہیں ہے اس لیے عام طور پر وہ خود سامان خریدنے کی بجائے اس کلائنٹ کو ہی خریداری کے لیے وکیل مقرر کر دیتا ہے کہ آپ یہ سامان خود خرید لیں اور اکثر کلائنٹ اپنا سپلائر بھی خود متعین کرتا ہے اور اس کا مطالبہ ہوتا ہے کہ بینک اسی سے مطلوبہ سامان خرید کر اسے فروخت کرے کلائنٹ کا بینک کے ساتھ یہ معاہدہ بھی ہوتا ہے کہ بیع کے بعد اگر اس نے وعدے کے مطابق ادائیگی نہ کی تو وہ اتنی رقم بینک کے زیر نگرانی قائم خیراتی فنڈ میں جمع کروائے گا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ قطعاً وہ نہیں جس کو ہمارے اسلاف نے جائز قرار دیا ہے بلکہ اس میں اور شرعی مرابحہ میں کئی اعتبار سے فرق ہے۔

- شرعی مرابحہ میں بیچا جانے والا سامان تاجر کے پاس پہلے سے موجود ہوتا ہے اس کے برعکس اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ میں مطلوبہ سامان بینک کے پاس موجود نہیں ہوتا۔
- شرعی مرابحہ میں چونکہ تاجر نے سامان خریداری کے آرڈر یا وعدہ کے بغیر خریدا ہوتا ہے اس لیے وہ حالات کے رحم وکرم پر ہوتا ہے ممکن ہے گاہک فوراً آجائے اور یہ فروخت ہو جائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کو طویل عرصہ تک انتظار کرنا پڑے اور یہ بھی خدشہ ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں بازار میں چیز کی قیمت کم ہو جائے اور یہ نقصان اٹھا کر بیچنے پر مجبور ہو۔ اسلامی بینکوں میں رائج مرابحہ میں بینک کو یہ خطرات درپیش نہیں ہوتے۔
- شرعی مرابحہ ایک ہی مرحلہ میں مکمل ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی بینکوں میں

مروجہ مرابحہ دو مرحلوں میں انجام پاتا ہے۔ پہلے مرحلہ میں وعدہ ہوتا ہے اور دوسرے مرحلہ میں عقد کی رسم ادا ہوتی ہے۔

- شرعی مرابحہ میں ادائیگی نقد بھی ہو سکتی ہے اور ادھار بھی لیکن بینکاری مرابحہ موجل ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ لوگ بینکوں میں جاتے ہی اس لیے ہیں کہ ان کے پاس رقوم نہیں ہوتیں۔
- شرعی مرابحہ کا معاملہ کرتے وقت سود فریقین کے وہم وخیال میں بھی نہیں ہوتا جبکہ اسلامی بینکوں میں نفع کا تعین ہی شرح سود سے ہوتا ہے۔
- شرعی مرابحہ میں صرف دو فریق ہوتے ہیں: (۱) بیچنے والا۔ (۲) خریدنے والا۔ اس کے برعکس یہاں ایک تیسرا فریق بینک بھی ہوتا ہے۔

مروجہ مرابحہ کا شرعی حکم:

یہ صورت چونکہ شرعی مرابحہ سے بالکل مختلف ہے اس لیے اس کو شرعی مرابحہ کی بنیاد پر جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کا جواز اس بات پر موقوف ہے کہ یہ پوری طرح شرعی اصول سے ہم آہنگ ہے یا نہیں؟

ذیل میں ہم شرعی اصول کی روشنی میں اس کی مختلف صورتوں کا الگ الگ حکم بیان کرتے ہیں۔

- اگر بینک کیساتھ کیے ہوئے وعدہ کی پابندی فریقین کے لیے لازمی ہو کہ بینک ہر صورت سامان دینے اور کلائنٹ خریدنے کا پابند تو یہ صورت عملاً بیع ہی کی ہے جو شرعی اصول سے متصادم ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

چنانچہ ڈاکٹر شیخ محمد سلیمان الاشقر لکھتے ہیں:

((واذا تم هذا فان الاتفاق في الحقيقة هو عقد لان ما فيه من اتفاق ارادتين على انشاء حق فهو عقد بلاريب ولو سمي وعداً فهو عقد ايضاً فاذا جرى الاتفاق على هذه الطريقة فهو عقد

باطل و حرام لاسباب))[بحوث فقيهة فى قضاء اقتصادية معاصرة: ج١ ص٨٢]

''جب یہ معاملہ پورا ہو جائے تو یقیناً یہ ایگریمنٹ درحقیقت عقد ہے کیوں کہ اس ایک حق کو وجود میں لانے کا جو دو ارادوں پر اتفاق ہے وہ بلاشبہ عقد ہے اگر چہ اسے وعدے کا نام بھی دیا جائے پھر بھی یہ عقد ہے جب ایگریمنٹ اس طریقے کے مطابق پورا ہو تو وہ چند اسباب کی بناء پر باطل اور حرام ہے۔''

وہ کون سے شرعی اسباب ہیں جن کی بنیاد پر یہ عقد حرام قرار پاتا ہے اس کی وضاحت میں شیخ اشقر فرماتے ہیں:

- اس کی حرمت کا پہلا سبب یہ ہے کہ بینک کلائنٹ کو ایک ایسی چیز بیچ رہا ہے جو ابھی تک اس کی ملکیت نہیں حالانکہ نبی ﷺ نے اس چیز کی بیع کی ممانعت فرمائی ہے جو قبضے میں نہ ہو۔ اور آپ ﷺ نے اس بیع سے بھی منع فرمایا ہے کہ ایسی چیز آگے بیچی جائے جو انسان کے پاس موجود نہ ہو۔
- بینک نے معلق بیع کی ہے کیوں کہ کلائنٹ بینک سے یہ کہتا ہے کہ اگر تم اس کو خرید لو تو میں تم سے لے لوں گا جبکہ بیع معلق صحیح نہیں ہے۔
- اس کی حرمت کا تیسرا سبب یہ ہے کہ یہ سود پر قرض دینے کا حیلہ ہے۔
- اگر بیچی جانے والی چیز کا تعلق غذائی اشیاء سے ہو تو اس میں ممانعت کا چوتھا سبب بھی شامل ہو جاتا ہے۔ جس کی طرف ابن عبدالبر نے اشارہ کیا ہے کہ نبی ﷺ نے طعام کی بیع سے منع فرمایا حتی کہ تاجر اسے اٹھا کر اپنے ٹھکانوں پر لے جائیں۔[بحوث فقيهة فى قضايا اقتصادية معاصرة: ج١ ص٧٢٧٣]

علاوہ ازیں یہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کے بھی مخالف ہے۔

((البيعان بالخيار مالم يتفرقا)) [صحيح بخاري: كتاب البيوع، باب كم يجوز الخيار]

''الگ ہونے تک بائع مشتری دونوں کو اختیار رہتا ہے۔''

لیکن بینک میں مروجہ مرابحہ میں یہ اختیار سلب کرلیا جاتا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((وإذا أری الرجل الرجل السعلة فقال اشتر هذه وأربحك فيها كذا فاشتراها الرجل فالشراء جائز والذی قال أربحك فيها بالخيار إن شاء أحدث فيها بيعا وإن شاء تركه وهكذا إن قال اشتر لی متاعا ووصفه له أو متاعا أی متاع شئت وأنا أربحك فيه فكل هذا سواء يجوز البيع الاول ويكون هذا فيما أعطى من نفسه بالخيار))[كتاب الام: ج ۳ ص ۳۹]

''جب ایک شخص دوسرے کو کوئی چیز دکھا کر یہ کہے کہ یہ خرید لیں میں آپ کو اتنا منافع دوں گا اس پر وہ شخص وہ چیز خرید لے تو یہ خریداری جائز ہوگی۔تاہم جس نے یہ کہا تھا کہ میں اتنا نفع دے دوں گا اس کو اختیار ہے اگر چاہے تو بیع کرے اور اگر چاہے تو چھوڑ دے۔اور اسی طرح اگر یہ کہے کہ میرے لیے فلاں قسم کا سامان خرید لو یا یہ کہے کہ جو سامان تم چاہو وہ خرید لو میں آپ کو اس میں اتنا نفع دوں گا تو پہلی بیع جائز ہوگی اور آڈر دینے والے کو اختیار ہوگا۔''

مزید لکھتے ہیں:

((وإن تبايعا به على أن ألزما أنفسهما الامر الاول فهو مفسوخ من قبل شيئين أحدهما أنه تبايعاه قبل يملكه البائع والثانی أنه على مخاطرة أنك إن اشتريته على كذا أربحك فيه كذا))

''اگر دونوں اس چیز کی اس طرح بیع کریں کہ وہ دونوں پہلے آڈر کو لازم سمجھیں تو یہ دو وجہ سے فسخ ہوگی۔

(۱) دونوں نے چیز ملکیت میں آنے سے پہلے بیع کی ہے۔

(۲) اس میں رسک ہے کیونکہ اس نے کہا ہے کہ اگر آپ اتنے کی خرید لیں تو میں آپ کو اتنا نفع دوں گا۔''[حوالہ مذکورہ]

نیز یہ بیع الکالی بالکالی کی قبیل سے ہے کیونکہ بینک نے سامان بعد میں دینا ہے۔اور کلائنٹ نے قیمت بعد میں ادا کرنی ہے۔شرعی طور پر یہ بھی ممنوع ہے۔

((أَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیه وسلم نَهَى عَنْ بَيْعِ الْكَالِيءِ بِالْكَالِيءِ))

[سنن دارقطني:٣١٠٥]

''بلاشبہ نبی ﷺ نے ادھار کے بدلے ادھار بیع سے منع فرمایا ہے۔''

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ روایت تو ضعیف ہے لیکن اس مسئلہ پر اجماع ہے کہ ادھار کی ادھار کے بدلے بیع جائز نہیں۔[نیل الاوطار: ج ٨،ص ٢١٣]

مالکی فقہاء نے مکروہ بیع کی ایک صورت یہ بھی ذکر کی ہے کہ آدمی کسی دوسرے سے یہ کہے کہ آپ کہ پاس فلاں فلاں چیز ہے جو آپ مجھے ادھار بیچ دیں وہ جواب دے کہ نہیں اس پر یہ کہے کہ یہ آپ خرید لیں میں آپ سے منافع پر ادھار خرید لوں گا اس پر وہ چیز خرید کر اپنے وعدے کے مطابق بیچ دے۔[الموسوعة الفقيهةالكويتية بحواله مواجب الجليل للحطاب البيان والتحصيل لابن رشد]

اسلامی بینک کاری کے ماہر ڈاکٹر رفیق یونس مصری لکھتے ہیں:

((فاذا لم يكن هناك خيار فانها لا تجوز لان المواعدة الملزمة في بيع المرابحة تشبه البيع نفسه حيث يشترط عندئذان يكون البائع مالكا للمبيع حتى لا تكون هناك مخالفة لنهى النبى ان يبيع الانسان ما ليس عنده فالمرابحة ظاهرها البيع و باطنها التمويل فانها لا تجوز))[المصارف الاسلامية:ص ٣٣]

''جب اختیار نہ ہو تو معاملہ جائز نہیں کیوں کہ بیع مرابحہ میں لازمی وعدہ نفس بیع کے مشابہہ ہے جب بیع میں یہ شرط ہے کہ فروخت کنندہ بیچی جانے والی چیز کا مالک ہو۔تو نبی ﷺ کہ اس فرمان کہ ''جو انسان کے پاس نہیں وہ بیچنا منع ہے۔'' کی مخالفت نہ ہو۔چنانچہ وعدہ غیر لازمی ہو تو مرابحہ جائز ہے لیکن جب مرابحہ کا ظاہری مطلب بیع

ہو اور حقیقت میں فنانسنگ ہو تو یہ جائز نہیں۔''

شیخ بکر بن عبداللہ ابوزید رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((فکیف یجوز للمصرف ان یبیع ما لم یملك اصلاً و یصافق و یربح فیه فملکه تقدیری لا حقیقی استیلاء ه علیه تقدیری لا حقیقی فالمنع من هذا یکون باب الاولی))[فقه النوازل : ج۲ ص۹۳]

''بینک کے لیے یہ کیسے جائز ہے کہ وہ ایک ایسی چیز بیچے کہ جس کا وہ بالکل ہی مالک نہیں ہے وہ سودا حاصل کر کے نفع حاصل کرتا ہے حالانکہ وہ چیز اسکی تقدیری ملکیت میں ہے نہ کہ حقیقی۔ چنانچہ اس کی ممانعت بدرجہ اولی ہونی چاہیے۔''

ڈاکٹر احمد ریان لکھتے ہیں:

((هذا العقد تکتنفه مجموعة من المحاذیر الفقهیة التی من اهمها: ان الوعد من العمیل بالشراء ، و موافقة المصرف علی ذلك؛ هو عقد حتی وان کتب فی الاوراق انه وعد، لان العبرة بالمعانی ولیست بالمبانی کما یقول الفقهاء ، و بما انه عقد فیشترط له توفر کافة شروط عقد البیع ، و اکثرها غیر متوفرة فیه))[فقه البیوع المنهی عنها مع تطبیقاتها الحدیثة فی المصارف الاسلامیة: ص ٤٤]

''اس عقد کو متعدد فقہی خرابیوں نے گھیرا ہوا ہے ان میں سے سب سے اہم یہ ہے کہ کلائنٹ کی طرف سے خریداری کا وعدہ اور بینک کی اس پر موافقت عقد ہے۔ اگرچہ کاغذات میں اس کو وعدہ لکھا جاتا ہے۔ کیونکہ فقہاء کے قول کے مطابق حقائق کا اعتبار کیا جاتا ہے نہ کہ الفاظ کا۔ اور جب یہ عقد ہے تو اس میں عقدِ بیع کی تمام شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے اور ان میں اکثر یہاں نہیں پائی جاتیں۔''

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ اس میں منافع کے لیے شرح سود کو معیار بنانے سے یہ معاملہ مزید مشکوک ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلامی بینک کاری کے حامی بھی اس کو

پسندیدہ قرار نہیں دیتے چنانچہ مولانا تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ حلال منافع کے تعین کے لیے سود کی شرح کا استعمال پسندیدہ نہیں اور اس سے یہ معاملہ کم از کم ظاہری طور پر سودی قرض کے مشابہ بن جاتا ہے اور سود کی شدید حرمت کے پیشِ نظر اس ظاہری مشابہت سے بھی جہاں تک ہو سکے بچنا چاہیے۔'' [اسلامی بینکاری کی بنیادیں: ص۱۲۴]

مزید لکھتے ہیں:

''البتہ یہ بات درست ہے کہ اسلامی بینکوں اور مالیاتی اداروں کو جتنا جلدی ممکن ہو اس طریقہ کار سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔ اس طرح کہ اول تو اس میں شرح سود کو حلال کاروبار کے لیے مثالی اور معیاری سمجھ لیا جاتا ہے جو کہ پسندیدہ بات نہیں دوسرے اس لیے کہ اس سے اسلامی معیشت کے بنیادی فلسفے کو فروغ نہیں ملتا۔ اس لیے کہ اس سے تقسیم دولت کے نظام پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔'' [اسلامی بینک کاری کی بنیادیں: ص:۱۲۵]

❀ اس معاملے کی دوسری صورت یہ ہے کہ وعدہ یک طرفہ ہو یعنی گاہک اپنے وعدے کا پابند ہو لیکن بینک آزاد ہو یہ صورت بھی درست نہیں کیونکہ نبی ﷺ کے ارشاد ''البیعان بالخیار'' میں بیچنے والے خریدنے والے دونوں کو اختیار دیا گیا ہے ایک کو پابند اور دوسرے کو مستثنیٰ رکھنا اس تفریق کی کوئی اصل نہیں چنانچہ ڈاکٹر رفیق یونس مصری لکھتے ہیں:

((انی اری ضرورۃ الخیار لکلاالمتواعدین اماالخیار لاحدھما فقط فھو تحکم)) [تعلیق مصارف الاسلامیۃ: ص ۳۲]

''میری رائے میں دونوں کو اختیار ضروری ہے فقط ایک کو اختیار سینہ زوری ہے۔''

❀ اس معاملے کی تیسری صورت یہ ہے کہ کلائنٹ اور بینک دونوں پابند نہ ہوں بینک کے چیز خریدنے کے بعد کلائنٹ کو بیع کرنے اور نہ کرنے دونوں کا اختیار ہو اس طرح بینک بھی اپنے فیصلے میں آزاد ہو تو یہ صورت جائز ہو گی لیکن جیسا کہ مولانا تقی عثمانی کے

حوالے سے بیان ہوا ہے کہ شرح سود کو معیار بنانے کیوجہ سے یہ معاملہ سودی قرض کے مشابہ بن جاتا ہے اس لیے اس سے بچنا ہی بہتر ہے۔اس موقع پر ڈاکٹر محمد سلیمان اشقر کے فتوی کا ذکر بھی مفید رہے گا۔

((نظام البیع المرابحة کما تجریه بعض البنوك الاسلامیة فی الوقت الرهن نظام غیر جائز وهو تحایل علی الربا او هو بیع السلعة من البنك قبل امتلاکها و کلاهما ممنوع شرعاً والسنة النبویة تمنع هذا البیع وان المذاهب الاربعة کلها تقول بانه محرم وخاصة مذهب المالکیة الذی ینص نصا صریحاً علی منعه والذین قالوا فی مؤتمر البنك الاسلامی بدبئ بجوازه غلطوا علی الفقه الاسلامی غلطاً کبیراً وانه لا مستند لهم فی ما قالوا))

[بحوث فقیهة فی قضایا اقتصادیة معاصرة: ج ۱ ص ۱۱۳، ۱۱۵]

''بیع مرابحہ کا نظام جس کو دور حاضر میں بعض اسلامی بینک جاری کیے ہوئے ہیں ناجائز ہے اور یہ سود کے حاصل کرنے کا حیلہ ہے یا یہ بینک کی طرف سے ایسی چیز کی بیع ہے جو ابھی اس کی ملکیت میں نہیں آئی اور دونوں شرعاً ممنوع ہیں اور سنت نبوی ﷺ اس بیع کی اجازت نہیں دیتی بلاشبہ مذہب اربعہ اس کو حرام قرار دیتے ہیں خاص طور پر مالکیوں کا مذہب جس نے اس ممانعت کی واضح طور پر صراحت کی ہے اور جنھوں نے دوبئ میں اسلامی بینک کی کانفرنس میں اس کو جائز قرار دیا۔انھوں نے فقہ اسلامی کے ذمے بہت بڑی غلطی لگائی اور ان کے پاس اپنی تائید میں کوئی دلیل نہیں ہے۔''

اسلامی بینکوں کا نقطہ نظر:

اسلامی بینکوں کی طرف سے اس کے حق میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ حقیقی بیع تب ہوتی ہے جب بینک مطلوبہ سامان خرید لیتا ہے اس سے پہلے صرف بیع کا وعدہ ہوتا ہے۔لہٰذا اس سے اوپر بیان شدہ خرابیاں لازم نہیں آتیں۔ بیع اور وعدہ میں فرق

ہے مثلاً بینک کی طرف سے مطلوبہ چیز خریدنے کے بعد اور کلائنٹ کے حوالے کرنے سے پہلے اگر وہ ضائع ہو جائے تو بینک کا نقصان ہوگا اسی طرح اگر بینک کی طرف سے خریداری کے بعد کلائنٹ انکار کر دے تو بینک اس کو کسی دوسرے شخص کو بیچ کر الگ لاگت سے جتنے پیسے کم ملیں گے وہ وعدہ کرنے والے سے وصول کرے گا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ باقاعدہ بیع نہیں ہے ورنہ نہ تو بینک نقصان کا ضامن ہوتا اور نہ ہی اس کو دوسری جگہ بیچنے کا اختیار ہوتا لیکن اگر غور کیا جائے تو دو وجہ سے یہ دلیل انتہائی کمزور ہے۔

ا۔ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں کہ لازمی وعدہ بیع ہی کی شکل ہے یہی وجہ ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ اور مالکی فقہاء نے ''مرابحة للامر بالشراء'' کی جس شکل میں اختیار نہ ہو کو ناجائز قرار دیا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ فقہائے احناف کے سرخیل حضرت امام محمد رحمہ اللہ نے اس خطرہ کے پیش نظر کہ ''آرڈر دینے والا خریدنے سے انکار نہ کرے''۔ کے لیے یہ حیلہ تجویز کیا ہے کہ جس کو آرڈر دیا گیا ہے وہ اس شرط پر خریدے کہ مجھے تین دن بعد واپس کرنے کا اختیار ہے اگر آرڈر دینے والا اپنے وعدے کے مطابق خرید لے تو اس کے حوالے کر دے۔ اگر اس کو دلچسپی نہ ہو تو اس اختیار کی بناء پر واپس کر کے نقصان سے محفوظ رہے گا۔[کتاب الحیل امام محمد بحوالہ بحوث فقیھة فی قضایا اقتصادیة معاصرة :ج ۱ ص ۱۰۲'۱۰۳]

یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ فقہاء احناف کے ہاں مرابحہ میں وعدہ پورا کرنا قانونی ذمہ داری نہیں ورنہ اس حیلے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

باقی رہ گیا وہ فرق جو اسلامی بینکوں کی جانب سے بیان کیا جاتا ہے تو اس سے معاملے کی حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہے وہ یہ کہ فریقین وعدے کے مطابق بیع کرنے کے پابند ہیں۔

۲۔ اس دلیل کی کمزوری کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جن آئمہ نے ایفائے وعدہ کو فرض کہا ہے۔ وہ تبرعات کے بارہ میں ہے نہ کہ معاوضات میں۔ بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ مشتری چیز

خرید کر بل بینک کے حوالے کرتا ہے بینک کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ اس میں درج رقم ادا کر کے اس پر نفع وصول کرے۔اس کو مرابحہ کا نام دے دیا جاتا ہے حالانکہ اس کا مرابحہ سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ سراسر سودی حیلہ ہے۔

یہی وجہ کہ بیع مرابحہ کی بنیاد پر بینکاری کا نظریہ دم توڑ رہا ہے۔چنانچہ ڈاکٹر رفیق یونس مصری لکھتے ہیں:

((وتجدد الاشارة الی ان نجم بیع المرابحه للامر بالشراء عند الافراد والعلماء والهیئات والمجامع آخذ فی الاخمال بل ان بعض العلماء کالشیخ مصطفی الزرقاء قد غیر رأیه تغیراً جذریا کما اعلن ذلك یوم الخمیس)) [۱۷-۹-۱٤۱٤ فی ندوة البرکة 'ص:۳۳]

''یہاں اس بات کی طرف اشارہ بھی مناسب رہے گا کہ ماہرین علماء اور مختلف کونسلوں اور اکیڈمیوں کے نزدیک خریداری کا آرڈر دینے والے کیساتھ بیع مرابحہ کا معاملہ کرنے کا ستارہ ڈوب رہا ہے۔بلکہ بعض علماء نے جیسا کہ شیخ محمد مصطفیٰ زرقاء ہیں کلیتًا اپنی رائے کو تبدیل کر لیا ہے جیسا کہ انہوں نے ۱۴۱۴-۰۹-۰۷ بروز جمعرات برکہ سیمینار میں اعلان کیا۔''

اجارہ مُنْتَهِيَةٌ بِالتَّمْلِيك:

یہ بھی اسلامی بینکوں میں فنانسنگ کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔اجارہ کی یہ صورت اسلامی بینکاری کی ایجاد کردہ ہے۔ہمارے واجب الاحترام محدثین وفقہاء اس سے واقف نہ تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی کتب میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔لہٰذا ہم بھی اس کے احکام جاننے کے لیے اسلامی بینکوں کی رہنمائی کے لیے مرتب کردہ شریعہ سٹینڈرڈز پر ہی اعتماد کریں گے۔چنانچہ شریعہ سٹینڈرڈز کے سکالرز نے اس کی تعریف یوں کی ہے۔

((هی اجارة یقترن بها الوعد بتملیك العین المُوجرة الی المستأجر فی نهایة مدة الاجارة اوفی اثنائها))[المعاییرالشرعیة :ص۱۵۳]

''ایسا اجارہ جس میں یہ وعدہ شامل ہو کر مدت اجارہ کے آخر میں یا اس کے دوران ہی کرائے پر دی گئی چیز کی ملکیت کرایہ دار کی طرف منتقل کر دی جائے گی۔''

ڈاکٹر وہبہ زحیلی حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

((هي تمليك منفعة بعض الاعيان كالدورو المعدات مدة معينة من الزمن باجرة معلومة تزيد عادة عن اجرة المثل وعلى ان يملك الموجر العين الموجرة للمستاجر بناء على وعد سابق بتمليكها في نهاية المدة او في اثنائها بعد سداد جميع مستحقات الاجرة او اقساطها و ذلك بعقد جديد)) [المعاملات المالية المعاصرة: ص ٣٩٤]

''اجارہ منتهية بالتمليك کا مطلب ہے کہ متعین وقت کے لیے طے شدہ کرائے جو عام طور پر اس طرح کی دوسری چیزوں کے کرائے سے زیادہ ہوتا ہے کے بدلے کسی چیز جیسے گھر یا سامان کے فائدے کا دوسرے کو مالک بنا دینا اس شرط پر کہ کرایہ کی تمام قسطیں ادا کرنے کے بعد مدت کرایہ کے اختتام پر یا اس کے دوران ہی مالک سابق وعدے کی بنیاد پر ایک نئے عقد کے ذریعے اس چیز کی ملکیت کرایہ دار کی طرف منتقل کر دے گا۔''

شرعی اجارہ اس سے مختلف ہے۔ اسلامی بینکاری کے حامی بھی اس بات کے قائل ہیں کہ شریعت نے اجارہ کا جو تصور دیا ہے وہ اس سے مختلف ہے چنانچہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی حفظہ اللہ لکھتے ہیں: اجارہ ''منتهية بالتمليك'' عام اجارہ سے دو لحاظ سے مختلف ہے:

۱۔ اجارہ ''منتهية بالتمليك'' دو مستقل عقدوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلا عقدِ اجارہ جو طے شدہ مدت تک جاری رہتا ہے دوسرا مدت کے اختتام یا دوانِ مدت اس چیز کو مالک بنانے کا عقد۔

۲۔ اجارہ ''منتهية بالتمليك'' میں بینک کرائے پر دی جانے والی چیز کلائنٹ کی درخواست کے بعد خریدتا ہے اکثر اس کا کرایہ عام کرایہ سے زیادہ ہوتا ہے جبکہ عام اجارہ میں وہ چیز

پہلے سے موجر کے پاس موجود ہوتی ہے۔[المعاملات المالیة المعاصرة وھبہ زحیلی: ص ۳۹۵]

اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ اور سودی بینکوں میں رائج ہائر پر چیز میں فرق:

اسلامی بینکوں کے نقطہ نظر کے مطابق دونوں میں فرق اس طرح ہے کہ ہائر پر چیز میں بیع اور اجارہ دونوں عقد بیک وقت شروع ہوتے ہیں آخری قسط کی ادائیگی پر مستقل عقد کیے بغیر ہی چیز کی ملکیت مستاجر کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جبکہ اجارہ منتهية بالتمليك میں مدت اجارہ کے ختم ہونے تک اجارہ کے احکام نافذ ہوتے ہیں اسکے بعد ملکیت مستاجر کی طرف منتقل ہوتی ہے۔[المعايير الشرعية:١٤٦]

اسی طرح اجارہ "منتهية بالتمليك" اور بیع قسط میں بھی فرق ہے۔بیع قسط میں عقد شروع میں ہی مکمل ہو جاتا ہے صرف قیمت قسطوں کی صورت میں ادا کی جاتی ہے جبکہ مذکورہ بالا اجارہ میں دو عقد ہوتے ہیں پہلے عقد اجارہ کی مدت پوری ہونے کے بعد ایک نیا عقد بیع۔[المعاملات المالية المعاصرة للدكتور وهبة الزحيلى:٣٩٥،٣٩٦]

ملکیت منتقل ہونے کے طریقے:

"المعايير الشرعية" میں اس کی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں۔

۱۔ رسمی یا حقیقی قیمت کے بدلے بیع کا وعدہ ہو یا مدت اجارہ کے دوران ہی باقی مدت کے کرائے کے بدلے یا مارکیٹ ریٹ کے مطابق بیع کا وعدہ ہو۔

۲۔ ہبہ کا وعدہ ہو۔

۳۔ ہبہ کا عقد ہو جو تمام اقساط کی ادائیگی کی شرط پر معلق ہو۔[ص ۱۴۱] البتہ یہ فیصلہ کرنا شروع میں ضروری ہے کہ کون سا طریقہ اختیار کیا جائیگا۔"المعايير الشرعية" میں یہ بھی صراحت ہے کہ یہ وعدہ موجر (بینک) کی طرف سے ہوگا۔مزید لکھا ہے کہ یہ وعدہ یک طرفہ ہوگا اور موجر (بینک) پر اس کی پابندی لازم ہوگی۔[ص ۱۴۲]

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ بینک جس پر چیز پر اجارہ کرتا ہے وہ پہلے

سے بینک کے پاس موجود نہیں ہوتی بلکہ وہ کلائنٹ کی درخواست پر خریدتا ہے۔اس میں یہ امکان بھی ہوتا ہے کہ بینک جب وہ چیز خرید لے تو کلائنٹ لینے سے انکار کر دے ظاہر ہے اس صورت میں بینک کے لیے یہ خسارے کا سودا ہوگا۔اسلامی بینکوں نے اس خطرے کا یہ حل نکالا ہے کہ وہ کلائنٹ سے متعلقہ چیز کی قیمت کا دس فیصد پہلے وصول کر لیے ہیں اسکو ''ضمانِ جدیہ'' کہتے ہیں۔تا کہ اگر کلائنٹ بینک کی خریداری کے بعد اپنی بات پر قائم نہ رہ سکے تو بینک کا نقصان نہ ہو اس صورت میں بینک اس کا معاملہ کسی دوسرے کے ساتھ کرے گا اور جتنا نقصان ہوگا وہ ضمان جدیہ سے پورا کرے گا۔اگر ضمان جدیہ کی رقم نقصان کی تلافی کیلیے ناکافی ہو تو وہ کلائنٹ سے مزید مطالبہ بھی کر سکتا ہے کیونکہ بینک کو یہ نقصان اس کی وجہ سے ہوا ہے اگر ضمان جدیہ سے نقصان پورا کرنے کے بعد کچھ رقم بچ جائے تو وہ کلائنٹ کی ہو گی۔شرعی اجارہ میں یہ نہیں ہوتا بلکہ اس میں وہ چیز مالک نے کسی کی درخواست کے بغیر خود خریدی ہوتی ہے اس میں یہ بھی امکان ہوتا ہے کہ کوئی کرایہ پر لینے کے لیے آجائے یا نہ آئے۔اس سے بھی ہمارے اس موقف کو تقویت ملتی ہے کہ اسلامی بینک نان رسک ادارہ ہے۔

ضَمَانِ جِدّیَہ کا حکم:

''المعاییر الشرعیۃ'' کے نقطہ نظر کے مطابق یہ رقم یا تو بینک کے پاس حفاظت کی غرض سے رکھی امانت تصور ہوگی۔بینک اس میں تصرف کا مجاز نہیں ہوگا یا اسکی حیثیت اس امانت کی ہوگی جو سرمایہ کاری کے لیے دی جاتی ہے یعنی کلائنٹ بینک کو اجازت دے گا کہ وہ اس رقم سے مضاربہ کی بنیاد پر سرمایہ کاری کرے اور یہ بھی جائز نہیں ہے کہ جب اجارہ کا باقاعدہ عقد ہو اس وقت یہ طے کر لیا جائے کہ رقم اجرت کی قسطوں میں شمار ہوگی۔[ص۱۳۴]

اگر چیز تباہ ہو جائے یا قابل استعمال نہ رہے؟

اس بارے میں شریعہ سٹینڈرڈز کا موقف بڑا واضح ہے کہ اگر اس میں مستاجر کا عمل دخل نہ ہو تو دونوں حالتوں میں اجرتِ مثل (مارکیٹ کرایہ) کی طرف لوٹا جائے گا۔اور عقد میں طے شدہ کرایہ کے مطابق بینک نے اجر مثل سے جتنا زیادہ لیا ہوگا وہ مستاجر

کو واپس کرنے کا پابند ہوگا۔[ص۱۴۲]

اجارہ "منتهية بالتمليك" کا شرعی حکم:

ڈاکٹر احمد ریان اسلامی بینکوں میں رائج اجارہ کی مروّجہ صورتوں میں پائی جانے والی خرابیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

- اس میں بیع کا عقد معلق ہوتا ہے یہ ایسی خرابی ہے جس کی ممانعت پر تمام فقہاء متفق ہیں۔
- عقد میں شرط پائی جاتی ہے بعض فقہاء کے نزدیک یہ بھی ممنوع ہے۔
- یہ معاملہ ایک عقد میں دو عقدوں پر مشتمل ہوتا ہے یعنی ایک بیع میں دو بیعوں کی ممانعت میں داخل ہے۔[فقه البيوع المنهى عنها مع تطبيقاتها الحديثة فى المصارف الاسلامية]

علاوہ ازیں اس میں حسبِ ذیل خرابیاں بھی پائی جاتی ہیں:

- جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عقدِ اجارہ کے وقت ہی بینک یہ وعدہ کرتا ہے کہ مدت اجارہ ختم ہونے پر رسمی یا حقیقی قیمت کے عوض یا مدت اجارہ کے دوران ہی باقی قسطوں کے بدلے یا بازاری قیمت پر یہ چیز مستاجر کی ملکیت میں دے دے گا۔ ڈاکٹر محمد زحیلی ﷾ لکھتے ہیں:

((اما ان كان الوعد ملزما فيدخل فى معاملات محرمة شرعا وهى بيع ما لا يملك والبيع قبل القبض بل قبل الشراء))

[المصارف الاسلامية:ص ۷۷،۷۸]

"اگر وعدہ لازمی ہو تو یہ شرعی طور پر حرام معاملات میں داخل ہو جائے گا۔ وہ ہیں غیر ملکیتی چیز اور قبضہ سے پہلے بلکہ خریدنے سے پہلے ہی بیع کا معاملہ۔"

یا ہبہ کرنے کا وعدہ ہوتا ہے یا تمام اقساط کی ادائیگی سے مشروط ہبہ کا عقد ہوتا ہے۔ جو صورت بھی ہو وہ غرر سے خالی نہیں۔ کیونکہ ایسا وعدہ بیع جس کی پابندی لازم ہو عملاً بیع ہی

ہے۔ اسلامی بینکنگ کے حامیوں کا یہ کہنا کہ یہ یکطرفہ وعدہ ہے جس میں ایک فریق کو اختیار ہے تو بقول ڈاکٹر رفیق یونس مصری کے صرف ایک کو اختیار دینا سینہ زوری ہے۔ جب یہ بیع ہی ہے تو عقد بیع کے وقت قیمت مجہول ہوتی ہے کیا علم کہ پانچ سال بعد حقیقی قیمت کیا ہوگی یا رسمی قیمت کیا مقرر ہوگی اور یہ بھی احتمال ہوتا ہے کہ مستاجر مکمل قسطیں ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے اس کے ملکیتی حقوق حاصل نہ کر سکے۔ اس کو ہبہ کا عقد کہنا بھی درست نہیں کیونکہ مستقبل کی شرط پر معلق ہبہ درست نہیں ہوتا جیسا کہ شیخ صالح بن فوزان حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

((ولا تصح الهبة المعلقة على شرط مستقبل كان يقول اذا حصل كذافقد وهبتك كذا)) [الملخص الفقهي:٢ص، ١١٥]

"مستقبل کی شرط پر معلق ہبہ صحیح نہیں ہے۔ جیسے یہ کہے کہ جب اس قسم کی چیز حاصل ہو گی تو میں فلاں چیز آپ کو ہبہ کر دوں گا۔"

ایسے ہی اس کو ہبہ کا وعدہ کہنا بھی درست نہیں کیونکہ اس صورت میں یہ ایسا ہبہ ہوگا کہ مارکیٹ ریٹ سے زیادہ کرایہ وصول کرنے کی صورت میں جس کا بدلہ لیا جاتا ہے۔ اس قسم کا ہبہ بھی بیع ہی کے حکم میں ہوتا ہے سوائے اس کے کہ اس میں معاوضہ اور اس کی مقدار طے نہیں ہوتی۔

- اس کی عملی تطبیق میں بھی گڑبڑ ہوتی ہے۔ وہ یوں کہ بینک اس مدت کا کرایہ بھی قسطوں میں ایڈجسٹ کرتا ہے جس میں گاڑی تو کلائنٹ کو نہیں ملی ہوتی لیکن بینک بکنگ کے لیے رقم جمع کروا چکا ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم پیچھے اسلامی بینکاری کے سکالر جناب محمد ایوب کے حوالے سے لکھ آئے ہیں۔
- اس میں شریعہ سٹینڈرڈز کے احکام کی بھی خلاف ورزی پائی جاتی ہے۔
- شریعہ سٹینڈرڈز کے مطابق بیع کا وعدہ بینک کی جانب سے ہونا چاہیے جبکہ اسلامی بینک کلائنٹ سے وعدہ لیتے ہیں۔
- شریعہ سٹینڈرڈز کے مطابق بینک ضمان جدیہ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس کے برعکس

اسلامی بینک کرنٹ اکاؤنٹ کی صورت میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی رپورٹیں ہیں کہ بعض اسلامی بینک ضمان جدیہ کو اسٹیٹ بینک کے پاس ریزرو کیش ریکوائرمنٹ کے طور پر بھی جمع کرواتے ہیں۔

* شریعہ سٹینڈرڈز کی رائے میں اجارہ پر دی ہوئی چیز اگر تباہ ہو جائے یا وہ باقی ماندہ مدت کے لیے قابل استعمال نہ رہے بشرطیکہ اس میں مستاجر کا عمل دخل نہ ہو تو بازاری قیمت سے زائد لیا ہوا کرایہ مستاجر کو واپس کیا جانا چاہیے لیکن اسلامی بینکوں میں اس پر عمل نہیں ہوتا بلکہ ان کا طریقہ یہ ہے کہ انشورنس یا تکافل کمپنی سے جو رقم ملتی ہے اس میں سے پہلے اپنی باقی ماندہ رقم پوری کرتے ہیں۔ اگر کچھ بچ جائے تو مستاجر کو دیتے ہیں ورنہ اللہ اللہ خیر سلا۔ اسلامی بینکوں کا یہ عمل انکے اپنے ہی شریعہ سٹینڈرڈز کے خلاف ہے۔

مشارکہ متناقصہ (Diminishing Musharakah):

اس کو شرکہ متناقصہ بھی کہتے ہیں اس کا معنی ہے تخفیف پذیر مشارکہ یعنی وہ مشارکہ جس میں ایک فریق اپنا حصہ وقفے وقفے سے دوسرے فریق کو بیچتا جاتا ہے بالآخر دوسر فریق کلی طور پر اثاثے کا مالک بن جاتا ہے۔ اسلامی بینکوں میں اس پر بھی بکثرت عمل ہوتا ہے اس کو زیادہ تر ہاؤس فنانسنگ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اجارۃ "منتهية بالتمليك" کی طرح یہ اصطلاح بھی اسلامی بینکاری نے ہی متعارف کروائی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا سب سے پہلے استعمال مصر میں شروع ہوا۔ [المعاملا ت المالية المعاصرة للدكتور محمد عثمان شبير: ص ۳۳۹]

ظاہر ہے جب ذخیرہ حدیث وفقہ میں اس اصطلاح کا ذکر ہی نہیں تو ہمیں اسکی حقیقت جاننے کے لیے اسلامی بینکنگ کے ماہرین کی طرف ہی رجوع کرنا پڑے گا۔ چنانچہ المعاییر الشرعیۃ میں اسکی تعریف یوں بیان ہوئی ہے۔

((المشاركة المتناقصة عبارة من شركة يتعهد فيها احد الشركاء بشراء حصة الآخر تدريجا الى ان يتملك المشترى المشروع بكامله)) [ایضًا۔ ص۲۰٦]

''مشارکہ متناقصہ ایسی شرکت سے عبارت ہے جس میں ایک شریک یہ عہد کرتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ دوسرے شریک کا حصہ خرید لے گا یہاں تک کہ مشتری پورے منصوبے کا مالک ہو جائے۔''

اسکی عملی تطبیق کیا ہوتی ہے؟ یہ سمجھنے کے لیے ہم جناب مولانا تقی عثمانی صاحب کی کتاب ''اسلامی بینکاری کی بنیادیں'' سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''مشارکہ کی ایک اور شکل جسے ماضی قریب میں ترقی دی گئی ہے ''مشارکہ متناقصہ'' ہے۔ اس تصور کے مطابق ایک تمویل کار اور اس کا عمیل کسی جائیداد، سامان یا کاروباری ادارے کی مشترکہ ملکیت حاصل کرتے ہیں۔ تمویل کار کا حصہ کئی یونٹس میں تقسیم کرلیا جاتا ہے اور یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عمیل تمویل کار کے حصے کے کئی یونٹس ایک ایک کر کے کچھ وقفوں کے بعد خرید لے گا جسکے نتیجے میں اس کا حصہ کم ہوتا رہے گا۔ یہاں تک کہ اس کے تمام یونٹس عمیل خرید لے گا اور جائیداد یا کاروباری ادارے کا تنہا مالک بن جائے گا۔''

شرکت متناقصہ کے اس تصور کو مختلف معاملوں میں مختلف طریقوں سے اختیار کیا جاتا ہے۔ چند نمونے ذیل میں دیے جاتے ہیں۔

اسے عام طور پر ہاؤس فنانسنگ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ عمیل ایک گھر خریدنا چاہتا ہے جس کے لیے اس کے پاس کافی رقم موجود نہیں ہے۔ یہ ایک تمویل کار کے پاس جاتا ہے جو اس کے ساتھ مل کر ایک گھر خریدنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ قیمت کا بیس فیصد عمیل ادا کرتا ہے اور اسی فیصد تمویل کار، لہٰذا گھر کے اسی فیصد حصے کا مالک تمویل کار ہے اور بیس فیصد کا عمیل، جائیداد کو مشترکہ خریدنے کے بعد عمیل گھر کو اپنی رہائشی ضرورتوں کے لیے استعمال کرتا ہے اور تمویل کار کو جائیداد میں اس کا حصہ استعمال کرنے کی وجہ سے کرایہ ادا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمویل کار کے حصے کو آٹھ برابر یونٹس میں تقسیم کرلیا جاتا ہے۔ ہر یونٹ گھر کے دس فیصد ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ (کیونکہ اس کی کل ملکیت اسی فیصد تھی) عمیل، تمویل کار سے یہ وعدہ

کرتا ہے کہ ہر تین ماہ بعد ایک یونٹ خریدے گا۔ چنانچہ تین ماہ کی پہلی مدت پوری ہونے پر وہ گھر کی قیمت کا دس فیصد حصہ ادا کر کے ایک یونٹ خرید لیتا ہے۔ اس سے تمویل کار کا ایک حصہ اسی فیصد سے کم ہو کر سترہ فیصد ہو جائے گا۔ تمویل کار کا ادا کیا جانے والا کرایہ بھی اس قدر کم ہو جائے گا۔ دوسری مدت کے پورا ہونے کے بعد ایک اور یونٹ خریدے گا جس سے جائیداد میں اس کا حصہ بڑھ کر چالیس فیصد ہو جائیگا اور تمویل کار کا کم ہو کر ساٹھ فیصد رہ جائے گا اور اسی تناسب سے کرایہ بھی کم ہو جائے گا۔ یہ ترتیب اسی طریقے سے چلتی رہے گی یہاں تک کہ دو سال کے اختتام پر عمیل تمویل کار کا سارا حصہ خرید لے گا جس سے اس کا حصہ ''صفر'' رہ جائے گا۔ اور عمیل کا حصہ سو فیصد ہو جائیگا۔

یہ طریقہ کار تمویل کار کو یہ اجازت دیتا ہے کہ جائیداد میں اپنی ملکیت کے تناسب سے کرایہ کا دعویٰ کرے اور اسی کے ساتھ اپنے حصے کے یونٹس کی بیع کے ذریعے سے اپنا اصل سرمایہ وقفے وقفے سے واپس حاصل کرے۔'' [ایضاً۔ص:۸۵،۸۶،۸۷]

یہ اقتباس ہے تو طویل مگر اس سے مشارکہ متناقصہ کی عملی صورت پوری طرح نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ اس اقتباس میں کوئی ایسی بات نہیں جو قابل تشریح ہو۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ بینک اپنے حصے کا کرایہ مارکیٹ ریٹ کی بجائے شرح سود کے مطابق وصول کرتا ہے۔

مشارکہ متناقصہ شرکت کی کس قسم میں داخل ہے:

''المعايير الشرعية'' کے مطابق شرکت کی یہ جدید قسم شرکۃ العنان کی ذیلی شاخ ہے۔ لہٰذا اس پر وہ تمام احکام نافذ ہوں گے جو عام شرکت پر ہوتے ہیں۔ خصوصاً شرکۃ العنان کے۔ علامہ وہبہ زحیلی حفظہ اللہ نے بھی اس کو شرکۃ العنان ہی قرار دیا ہے۔ [المعاملات المالية المعاصرة: ص ٤٣٦]

''شركة العنان'' کیا ہے؟

شرکت کی بنیادی قسمیں دو ہیں:

۱۔ شركة الاملاك۔

۲۔ شركة العقود۔

شرکہ املاک کسی چیز کے استحقاق میں شراکت کا نام ہے جیسے کسی اثاثے، کارخانے یا گاڑی وغیرہ کی ملکیت میں اشتراک۔ جبکہ تصرف میں اشتراک کو شرکۃ العقود کہا جاتا ہے۔ جیسے خرید وفروخت میں اشتراک، یہ اشتراک یا تو مال وعمل دونوں میں ہوگا یا صرف عمل میں۔ اسکی پانچ قسمیں ہیں۔

''اگر مال وعمل دونوں میں شراکت ہو تو اس کو شرکۃ العنان کہا جاتا ہے۔''

[الملخص الفقهي:۲ ص۶۸]

چونکہ ہمارے زیرِ بحث یہی قسم ہے اس لیے ہم صرف اسی کے متعلق گفتگو کریں گے۔ علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے اسکی حقیقت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

((ان يشترك رجلان بماليهما على ان يعملا فيهما بابدانهما والربح بينهما)) [المغني:۷ ص۱۲۳]

''دو شخص اپنے اپنے مال کے ساتھ اس شرط پر اشتراک کریں کہ دونوں جسمانی محنت کریں گے اور نفع ان دونوں میں تقسیم ہوگا۔

شیخ صالح بن فوزان حفظہ اللہ فرماتے ہیں:

((فحقيقة شركة العنان ان يشترك شخصان فاكثر بماليهما بحيث يصيران مالا واحدا يعملان فيه بيديهما او يعمل فيه احدهما ويكون له الربح اكثر من نصيب الآخر)) [الملخص الفقهي:۲ ص۷۱]

''شركة العنان'' کی حقیقت یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ افراد اپنے مالوں کے ساتھ شراکت داری کریں اس طرح کہ دونوں کا مال ایک ہی بن جائے۔ دونوں اس میں جسمانی محنت کریں یا ان میں سے صرف ایک کرے (دوسری صورت میں) کام کرنے والے کے نفع کا حصہ دوسرے سے زیادہ ہوگا۔''

''المعايير الشرعية'' میں ہے:

''شرکہ عنان اس چیز کا نام ہے کہ دو یا دو سے زیادہ متعین مال کے ساتھ شراکت داری کریں اس طرح دونوں میں سے ہر ایک کو شراکت کے مال میں تصرف کا حق ہو اور نفع ان دونوں کے درمیان طے شدہ اصول کے مطابق تقسیم ہوگا اور خسارہ اپنے اپنے حصے کے مطابق برداشت کریں گے۔'' [ص ۱۹۵]

ان عبارتوں سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ شركة العنان میں فریقین کا مقصد چیز کو فروخت کر کے نفع کمانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شركة العنان کی شرطوں میں ایک شرط یہ ہے کہ نفع میں فریقین میں سے ہر ایک کا حصہ طے ہو۔ ملاحظہ ہو: [نیل المآرب بشرح دلیل الطالب: ص ۱۹۳، الملخص الفقهی: ۲ ص ۷۰۔]

لیکن جب ہم بینکوں میں رائج مشارکہ متناقصہ کو دیکھتے ہیں تو اس میں یہ چیز نظر نہیں آتی یہاں نہ تو نفع کا تناسب طے ہوتا ہے اور نہ ہی کلائنٹ کا مقصد اسکو فروخت کر کے نفع کمانا بلکہ وہ تو اپنی رہائش کے لیے یہ معاملہ کرتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ مشارکہ متناقصہ شرکہ عنان میں داخل نہیں ہے۔

مشارکہ متناقصہ میں بینک اپنے حصے کے یونٹ کس قیمت پر بیچے گا:

یہاں چار صورتیں ہی ممکن ہیں:

۱۔ بینک نے جتنی رقم لگائی ہے اس سے زیادہ کے بدلے بیچے۔

۲۔ اتنے ہی کا بیچے۔

۳۔ اس سے کم پر بیچے۔

۴۔ بازاری قیمت کے مطابق فروخت کرے۔

تیسری صورت ممکن نہیں کیونکہ اس میں بینک راضی نہیں ہوگا۔ باقی تین صورتیں شرعاً جائز نہیں۔ پہلی صورت اس لیے کہ اس میں گویا بینک نے ضمانت لی ہے کہ اس کا رأس المال مع نفع اسے لوٹایا جائیگا۔ یہ شراکت کے اصولوں کے خلاف ہے۔ شرکت کی تو بنیاد ہی

اس پر ہے کہ نفع اور نقصان میں دونوں شریک ہوں گے گویا یہ حصول سود کا ایک حیلہ ہے۔

دوسری صورت (یعنی اتنے ہی کا بیچے) کو خود اسلامی بینکنگ کے ماہرین ناجائز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ المعاییر الشرعیة میں ہے:

((ولا یجوز اشتراط البیع بالقیمة الاسمیة)) [ص۲۰۷]

''قیمت اسمیہ (Face Value) پر بیع کی شرط لگانا جائز نہیں۔''

دوسری جگہ ہے:

((ولا یجوز الوعد بالشراء بالقیمة الاسمیة)) [ص۱۹۹]

''قیمت اسمیہ (Face Value) پر خریدنے کا وعدہ کرنا ناجائز ہے۔''

اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ گویا بینک نے یہ گارنٹی حاصل کر لی ہے اس کا رأس المال بہر صورت واپس کیا جائے گا۔ یہ شرکت کے اصول کے منافی ہے۔

آخری صورت اس لیے جائز نہیں کہ اس میں غرر پایا جاتا ہے کیونکہ کلائنٹ کی طرف سے خریدنے کا وعدہ لازمی ہوتا ہے جس سے وہ منحرف نہیں ہوسکتا۔ اس کے متعلق ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ بیع میں لازمی وعدہ بیع ہی کی ایک شکل ہے۔ جب بیع اس شرط پر ہو کہ مستقبل میں جو بازاری قیمت ہوگی اس پر میں خریدلوں گا تو اس میں غرر واضح ہے۔

بینک اپنا حصہ کس قیمت پر فروخت کرتا ہے:

اس تحقیق کی غرض سے جب ہم نے اسلامی بینکاری کے ریسرچ سکالر جناب محمد ایوب جو اسٹیٹ بینک شعبہ اسلامی بینکاری کے اسٹنٹ رہے ہیں اور انہوں نے اس موضوع پر انگریزی میں ایک کتاب بھی لکھی ہے جو لندن سے شائع ہو چکی ہے، سے پوچھا تو ان کے بقول بینک اپنے یونٹس قیمت اسمیہ پر فروخت کرتا ہے۔ کیونکہ بینک کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے لگائے ہوئے سرمایہ کو مختلف یونٹس میں تقسیم کر لیتا ہے۔ مثلاً اگر بینک نے دس لاکھ روپیہ لگایا ہے تو وہ اس کو پچاس پچاس ہزار کے بیس یونٹس میں تقسیم کرے گا۔ جو کلائنٹ نے وقفے سے اتنی ہی قیمت میں خریدنے ہوتے ہیں۔ ہمارے اس سوال پر کہ یہ تو شریعہ

سٹینڈرز کے مطابق جائز نہیں، انہوں نے کہا کہ شریعہ سٹینڈرز مشارکہ متناقصہ کو شرکۃ العنان جو کہ شرکہ عقد کی قسم ہے کے تناظر میں دیکھتا ہے جبکہ اسلامی بینک اس کو شرکہ ملک میں شمار کرتے ہیں۔ شرکہ عقد میں تو قیمت اسمیہ پر فروخت کرنے کا معاہدہ نہیں ہوسکتا البتہ شرکہ ملک میں جائز ہے۔ لیکن یہ رائے دو وجہ سے درست نہیں۔

۱۔ بقول ڈاکٹر رفیق یونس مشارکہ متناقصہ میں بینک کی غرض شراکت داری نہیں ہوتی نہ ہی اس کے پیش نظر بیع اور اجارہ ہوتا ہے بلکہ اصل مقصد تمویل ہے۔ اس میں بیع اور اجارہ کو گھسیٹنے کا مقصد تو صرف تمویل کے ذریعے فائدہ حاصل کرنا ہے۔ جیسا کہ ہم پیچھے ان کے حوالے سے بیان کر آئے ہیں۔

۲۔ شرکہ ملک میں کوئی فریق دوسرے کو اس پر مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ ضرور اس کا حصہ خریدے جبکہ یہاں شروع ہی میں یہ معاہدہ ہو جاتا ہے کہ کلائنٹ بینک کا حصہ خریدنے کا پابند ہوگا۔ ڈاکٹر رفیق یونس مصری بینکوں میں رائج مشارکہ متناقصہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

((ولا شك ان المشروعية تكون حيث يكون الوعد غير ملزم والتناقص بالقيمة السوقية، والتنازل عن الملكية تدريجيا مع كل قسط......وقل من يفعل ذلك كله من المصارف الاسلامية، سبب ذلك ان هذه العملية ظاهرها المشاركة وحقيقتها التمويل المصرفي)) [المصارف الاسلامية:ص ٤٢]

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تب جائز ہوسکتا ہے جب وعدہ لازمی نہ ہو اور بازاری قیمت پر فروخت ہو اور بینک اپنی ملکیت سے ہر قسط سے تدریجا دست کش ہو۔ شاذ و نادر ہی کوئی اسلامی بینک ایسا ہوگا جو یہ تمام شرطیں پوری کرتا ہو۔ اس کا سبب یہ ہے بظاہر یہ کاروائی مشارکہ اور حقیقت میں بینکنگ فنانسنگ ہے۔

تَوَرُّق:

مروجہ اسلامی بینکوں میں تمویل کا چوتھا ذریعہ تورق ہے۔ اس کا مطلب ایسی بیع ہے

جس کا مقصد چیز کو ذاتی استعمال میں لانا یا نفع کمانا نہیں بلکہ محض نقدی حاصل کرنا ہوتا ہے۔مثلاً ایک شخص کو نقدی کی ضرورت ہے تو وہ کوئی چیز ادھار زیادہ قیمت پر خرید کر نقد کم پر فروخت کر دے۔اس میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ چیز کسی تیسرے شخص کو فروخت کرے نہ کہ اسی کو جس سے خریدی ہے۔چنانچہ **الموسوعة الفقية الكويتية** میں بیع تورق کا اصطلاحی معنی یوں لکھا ہے:

((والتورق في الاصطلاح ان يشترى سلعة نسيئة ثم يبيعها نقدا بغير البائع باقل مما اشتراها به ليحصل بذلك على النقد))

''اصطلاح میں تورق کا معنی ہے کہ آدمی کوئی چیز ادھار خریدے پھر بیچنے والے کے علاوہ کسی دوسرے کے پاس قیمت خرید سے کم قیمت پر فروخت کردے تا کہ اس طریقہ سے نقد رقم حاصل کر سکے۔''

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((ولو كان مقصود المشترى الدرهم وابتاع السلعة الى اجل ليبيعها وياخذ ثمنها فهذا يسمى التورق)) [مجموعه فتاوىٰ: ٢٩، ص ٣٠]

''اگر خریدار کا مقصد درہم ہو اور وہ ادھار سودا خریدے تا کہ اسے بیچ کر پیسے حاصل کر سکے تو اسے تورق کہتے ہیں۔''

دوسری جگہ بیع عینہ اور تورق میں فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((واما الذى لم يعد الى البائع بحال بل باعها المشترى من مكان اخر لحاره فهذا يسمى التورق))[مجموعه فتاوىٰ:٢٩ ص ٤٣]

''جب چیز کسی بھی حالت میں بائع کی طرف نہ لوٹے بلکہ مشتری اس کو دوسری جگہ فروخت کردے تو اسکو تورق کہا جاتا ہے۔''

تورق اور بیع عینہ میں فرق:

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((فهذا المضطر ان اعاد السلعة الى بائعها فهى العينة وان باعها لغيره فهو التورق)) [اعلام الموقعين: ج٣ ص٩٤٩]

’’مجبور شخص اگر چیز کو بیچنے والے کے پاس فروخت کرے تو اسکو عینہ کہتے ہیں اگر وہی چیز کسی دوسرے کے پاس فروخت کرے تو اس کو تورق کہتے ہیں۔‘‘

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

((فَأَحْمَد رَحِمَهُ اللّٰه تَعَالَى أَشَارَ إِلَى أَنَّ الْعِيْنَة إِنَّمَا تَقَع مِنْ رَجُل مُضْطَرّ إِلَى نَقْدٍ لِأَنَّ الْمُوْسِر يَضَنّ عَلَيْهِ بِالْقَرْضِ فَيَضْطَرّ إِلَى أَنْ يَشْتَرِيْ مِنْهُ سِلْعَة ثُمَّ يَبِيْعهَا فَإِنْ اِشْتَرَاهَا مِنْهُ بَائِعهَا كَانَتْ عِيْنَة وَإِنْ بَاعَهَا مِنْ غَيْره فَهِيَ التَّوَرُّق)) [تهذيب السنن: ج٥، ص١٠٨]

’’امام احمد ؒ نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ بیع عینہ کا معاملہ اس شخص سے ....ہوتا ہے جو نقدی کا محتاج ہوتا ہے کیونکہ خوشحال شخص اسکو قرض دینے میں بخل سے کام لیتا ہے تو وہ اس پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس سے کوئی چیز خرید کر پھر اس کو بیچ دے۔ اگر اس چیز کو وہ بیچنے والا ہی خریدے تو یہ بیع عینہ ہوتی ہے اور اگر وہ کسی دوسرے کے پاس بیچے تو اس کو تورق کہتے ہیں۔‘‘

قطر کے معروف عالم ڈاکٹر علی احمد سالوس حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

((والتورق بهذا المعنى هو العينة عند الائمة الاربعة ومن جاء بعدهم ببضعة قرون ولعل شيخ الاسلام ابن تيمية هو اول من ذكر هذا التورق ثم جاء اقوال الحنابلة من بعده))[موسوعة القضايا الفقيهة المعاصرة:ص٨٩٨]

’’آئمہ اربعہ اور ان کے بعد کئی صدیوں تک جو آئے ان کے نزدیک اس معنی میں تورق بیع عینہ ہی ہے۔ شاید شیخ الاسلام ابن تیمیہ ؒ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس تورق کا ذکر کیا پھر ان کے بعد فقہاء حنابلہ کے اقوال میں اس کا تذکرہ آیا ہے۔‘‘

"الموسوعة الفقية" کے مطابق اس اصطلاح کا ذکر صرف فقہاء حنابلہ کے ہاں ملتا ہے دوسرے فقہاء اسکو بیع عینہ کے تحت زیر بحث لاتے ہیں۔

((یذکر الفقهاء التورق فی بحث بیع العینة والبیوع المنهی عنها والربا))

''فقہاء بیع تورق کو بیع عینہ ممنوعہ بیوع اور سود کی بحث میں ذکر کرتے ہیں۔''

تورق کا شرعی حکم:

اس کے شرعی حکم میں تین آراء ہیں:

۱۔ سعودی عرب کے سابق مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں یہ جائز ہے۔ [فتاویٰ اسلامیہ: ج ۲۔ص ۴۴۳] بعض دوسرے علماء کی بھی یہی رائے ہے۔

۲۔ شیخ عثیمین رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں اگر انسان کو رقم کی ضرورت ہو اور یہ جائز طریقہ سے ممکن نہ ہو اور عقد میں سود کی مشابہت نہ پائی جائے اور آدمی چیز کو قبضے کے بعد ہی فروخت کرے تو اس کی اجازت ہے ورنہ نہیں۔ [رسائل فقیهة: ص ۱۰۷]

۳۔ یہ کسی بھی صورت جائز نہیں۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اسکو مکروہ کہا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز فرماتے ہیں:

((التورق اخیة الربا ای اصل الربا وهذا القول اقوی))

[مجموعه فتاویٰ: ۲۹ ص ۴۳۱]

''تورق ربا کی جڑ ہے یعنی ربا میں ملوث کرنے کا باعث ہے یہ قول زیادہ قوی ہے۔''

عظیم محدث امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

((وکان شیخنا رحمه الله یمنع من مسالة التورق وروجع فیها مرارا وانا حاضر فلم یرخص فیها وقال المعنی الذی لاجله حرم الربا

موجود فیھا بعینة من زیادة الکلفة بشراء السلعة و بیعھا و الخسارة فیھا فالشریعة لاتحرم الضرر الادنیٰ وتبیح ما ھو اعلی منه))

[اعلام الوقعین: ج۳ص ۹۵۰]

''ہمارے استاد (امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ) تورق سے منع کرتے تھے۔ان سے میری موجودگی میں متعدد مرتبہ پوچھا گیا مگر انہوں نے اس کی اجازت نہ دی وہ فرماتے تھے جس وجہ سے سود کو حرام قرار دیا گیا ہے وہ اس (تورق) میں بعینہ موجود ہے۔اس کے ساتھ چیز خریدنے اور بیچنے کی تکلیف الگ ہے۔یہ کیسے ممکن ہے کہ شریعت کم تر ضرر کو تو حرام قرار دے مگر بڑے ضرر کو جائز قرار دے۔''

الموسوعة الفقیة الکویتیة میں لکھا ہے کہ جمہور علماء اس کو جائز سمجھتے ہیں۔لیکن ڈاکٹر علی احمد سالوس حفظہ اللہ موسوعہ کے اس دعویٰ سے متفق نہیں ہیں۔چنانچہ انہوں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ جمہور فقہاء بھی اس کو غلط ہی قرار دیتے ہیں۔ان کے خیال میں یہ بیع عینہ ہی میں شامل ہے۔تفصیل کے لیے دیکھیے انکی کتاب ''موسوعة القضایا الفقیھة المعاصرة''

راجح رائے:

اگر قائلین اور مانعین کے دلائل کا موازنہ کیا جائے تو ان حضرات کی رائے زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے جو اس کے حق میں نہیں ہیں۔نتیجے کے اعتبار سے تورق اور سود میں کوئی فرق نہیں ہے۔کیونکہ جب تورق میں اصل غرض نقدی حاصل کرنا ہے نہ کہ کسی بھی لحاظ سے چیز سے فائدہ اٹھانا تو ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت لینے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔اسی لیے تو امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ جس وجہ سے سود حرام ہے وہ اس میں بعینہ موجود ہے۔بلکہ خرید وفروخت کی تکلیف اضافی ہے۔

بینکوں میں تورق کا استعمال:

ہماری معلومات کے مطابق پاکستان میں ابھی تک اسلامی بینکوں نے اس پر عمل شروع

نہیں کیا۔البتہ ملائشیا اور بعض عرب ممالک میں کچھ سالوں سے اس کا استعمال جاری ہے۔زیادہ تر یہ معاملہ عالمی مارکیٹ میں میٹل جیسے زنک ، برونز،نکل اور تانبے وغیرہ کے سودوں میں کیا جاتا ہے۔اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک ایسا گاہک جس کو نقدی کی ضرورت ہوتی ہے ۔اسلامی بینک سے یہ کہتا ہے کہ کہ وہ اس نوع کا میٹل جو عام طور پر دوسرے ملک میں ہوتا ہے،ادھار قسطوں پر خریدنے کے لیے تیار ہے ۔یہ سودا میٹل کے یونٹ کے حساب سے ہوتا ہے۔جس کا وزن اور قیمت طے ہوتی ہے اور یہ بھی پہلے ہی طے ہوتا ہے کہ سودا مکمل ہونے کے بعد بینک گاہک کے وکیل کی حیثیت سے اس کو آگے فروخت کر کے رقم اس کے کھاتے میں جمع کر دے گا۔جو وہ نکلوا کر اپنی ضرورت پوری کر سکے گا۔ظاہر ہے کہ بینک نے ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت لگائی ہے اور آگے کم قیمت پر فروخت کرنا ہے۔دونوں دو سودوں کے درمیان جو فرق ہوگا وہ بینک کا نفع ہوگا۔مثلاً بینک نے ایک لاکھ ڈالر کا ایک سودا ادھار قسطوں پر بیچا ہے تو وہ اس کے وکیل کی حیثیت سے آگے اس کو پچانوے ہزار ڈالر میں فروخت کر کے رقم اس کے کھاتے میں جمع کروا دے گا۔جس سے وہ اپنی مالی ضرورت پوری کر لے گا۔بینک ایک لاکھ ڈالر قسطوں میں وصول کرے گا۔اس طرح بینک کو پانچ ہزار ڈالر کا فائدہ ہو جائے گا۔تورق کی یہ قسم کئی لحاظ سے سطور بالا میں بیان ہونے والی قسم سے مختلف ہے۔

- اس میں فروخت کنندہ یعنی بینک خریدار اور فروخت کنندہ کے درمیان واسطہ ہوتا ہے۔جبکہ پہلی قسم میں فروخت کنندہ کا درمیان میں کوئی کردار نہیں ہوتا۔
- تورق کی اس نوع میں نقدی کا ضرورتمند خود بینک سے جس کا اب وہ مدیون (مقروض) ہو چکا ہے رقم وصول پاتا ہے۔جبکہ تورق کی اول الذکر قسم میں وہ آخری خریدار سے خود وصول پاتا ہے۔اس میں پہلے فروخت کنندہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔
- اسلامی بینکوں میں رائج تورق ادھار اور نقد دو بیعوں کو مجموعہ ہوتی ہے۔جو حقیقت میں ایک دوسرے کے ساتھ مشروط ہوتی ہے۔فقہی تورق میں یہ چیز نہیں ہوتی۔

❁ فقہی تورق میں وہ چیز زیادہ یا قیمتِ خرید پر بکنے کا احتمال بھی ہوتا ہے لیکن بینکوں میں رائج تورق میں اس کا کم قیمت پر بیچنا طے ہوتا ہے۔

شرعی حیثیت:

❁ جب راجح رائے مطابق تورق بذات خود منع ہے تو یہ صورت بدرجہ اتم ممنوع ہونی چاہیے کیونکہ یہ کئی لحاظ ہے اس سے مختلف ہے اور پھر سب کام بینک کے کرنے کی وجہ سے اس کی مشابہت سود اور بیع عینہ سے ہو جاتی ہے۔

❁ نبی ﷺ کا فرمان ہے ایک بیع میں دو شرطیں درست نہیں۔اس میں تو کئی شرطیں پائی جاتی ہیں مثلاً:

* یہ شرط کہ مشتری بینک کو وکیل بنائے گا۔
* مشتری وکالت منسوخ نہیں کر سکتا۔
* بینک کی قیمت خرید سے زیادہ پیسے دے گا۔
* آگے کم قیمت پر فروخت کرے گا۔

❁ جس چیز پر سودا ہوتا ہے وہ بینک کے پاس پہلے سے موجود نہیں ہوتی بلکہ بینک بعد میں خریدتا ہے۔اس طرح یہ "مرابحة للآمر بالشراء" ہے جو بذات خود جائز نہیں۔

بَیْعِ سَلَمْ:

بعض اسلامی بینکوں میں تمویلی سرگرمیوں کے لے بیع سلم کا استعمال بھی جاری ہے سلم ایک معروف شرعی اصطلاح ہے جس سے مراد لین دین اور خرید و فروخت کی وہ قسم ہے جس میں ایک شخص یہ ذمہ داری قبول کرتا ہے کہ وہ مستقبل کی فلاں تاریخ پر خریدار کو ان صفات کی حامل فلاں چیز مہیا کرے گا۔شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَالسَّلَمُ شَرْعًا بَيْعٌ مَوْصُوفٌ فِي الذِّمَّةِ)) [فتح الباری: ج ٤ ص ٥٤٠]

''سلم کا شرعی معنی ہے ایسی چیز بیچنے کی ذمہ داری اٹھانا جس کی صفات بیان کر دی گئی ہوں''

اس کو سلف بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں بیچی گئی چیز کی قیمت معاہدے کے وقت ہی ادا کر دی جاتی ہے۔ یعنی یہ بیع کی وہ قسم ہے جس میں قیمت تو فوری ادا کر دی جاتی ہے مگر چیز بعد میں فراہم کی جاتی ہے۔

نبی ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہاں بیع کی یہ صورت بھی رائج تھی آپ ﷺ نے اس سے کلیۃً منع کرنے کی بجائے بنیادی اصلاحات کر کے اس کو باقی رکھا جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

((قَدِمَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم الْمَدِيْنَةَ ، وَهُمْ يُسْلِفُوْنَ بِالتَّمْرِ السَّنَتَيْنِ وَالثَّلَاثَ ، فَقَالَ مَنْ أَسْلَفَ فِيْ شَيْءٍ فَفِيْ كَيْلٍ مَعْلُوْمٍ وَوَزْنٍ مَعْلُوْمٍ ، إِلٰى أَجَلٍ مَعْلُوْمٍ)) [صحيح بخاری:باب السلم فی وزن معلوم]

''نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے تو لوگ کھجوروں میں دو اور تین سال کے لیے بیع سلم کرتے تھے اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص بیع سلم کرنا چاہتا ہے وہ متعین پیمانے اور وزن میں متعین مدت کے لیے کرے۔''

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

((أَشْهَدُ أَنَّ السَّلَفَ الْمَضْمُوْنَ إِلٰى أَجَلٍ مُسَمًّى قَدْ أَحَلَّهُ اللّٰهُ فِيْ كِتَابِهٖ وَأَذِنَ فِيْهِ ثُمَّ قَرَأَ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ﴾)) [مصنف ابن ابی شيبة: ج۵ ص ۲۷۷، مستدرك حاكم: ج۷ ص ۲۵۸]

''میں گواہی دیتا ہوں کہ مقررہ مدت تک ضمانت دی گئی سلم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جائز قرار دیا ہے اور اس کی اجازت دی ہے۔ پھر انہوں نے قرآن حکیم کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔''

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ﴾ [البقرة: ۲۸۲]

''اے ایمان والو! جب تم آپس میں مقررہ وقت تک ادھار کا معاملہ کرو تو اس کو لکھ لیا کرو۔''

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

((إِنَّا كُنَّا نُسْلِفُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم وَأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ فِي الْحِنْطَةِ ، وَالشَّعِيرِ وَالزَّبِيبِ ، وَالتَّمْرِ)) [صحيح بخاری: باب السلم فی وزن معلوم]

''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں گندم، جو، کھجور اور منقہ میں بیع سلم کرتے تھے۔''

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَاتَّفَقَ الْعُلَمَاءُ عَلَى مَشْرُوعِيَّتِهِ إِلَّا مَا حُكِيَ عَنْ اِبْنِ الْمُسَيِّبِ))

[فتح الباری: ج ٤ ص ٥٤٠]

''سعید بن مسیب رحمہ اللہ کے علاوہ تمام علماء اس کے جواز پر متفق ہیں۔''

سلم کی اجازت کا فلسفہ:

بعض کسانوں اور مینوفیکچرز کے پاس ضرورت کے مطابق مثلاً بیج، کھادوں، آلات، خام مال خریدنے اور لیبر کے لیے رقم نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کو اسلام نے یہ سہولت دی ہے کہ وہ حصول رقم کی خاطر اپنی فصل یا پیداوار قبل از وقت فروخت کر سکتے ہیں تا کہ قرض کے لیے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچے رہیں۔ اضافی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی چیز بیچنے کے لیے کسٹمر تلاش کرنے کی فکر سے آزاد ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کا سودا پہلے ہی ہو چکا ہوتا ہے۔ اس سے خریدار کو بھی فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ سلم میں قیمت ان چیزوں کی نقد قیمت سے کم ہوتی ہے جو نقد ادا کی جاتی ہو۔ مزید برآں اگر چیز آگے بیچنا چاہتا ہو تو مارکیٹنگ کے لیے مناسب وقت مل جاتا ہے۔

کیا سلم خلافِ قیاس ہے؟

شرعی اصول کے مطابق انسان کو وہی چیز بیچنے کی اجازت ہے جو نہ صرف وجود میں

آ چکی ہو بلکہ اس کی ملکیت اور قبضہ میں ہو جبکہ سلم میں عقد کے وقت چیز کا وجود ہی نہیں ہوتا۔اس بنا پر بعض فقہاء نے کہا ہے کہ سلم بیع معدوم کی ایک استثنائی صورت ہے۔مگر امام ابن قیم رحمہ اللہ اس سے متفق نہیں ہیں چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

((وأما السلم فمن ظن أنه على خلاف القياس توهم دخوله تحت قول النبي صلى الله عليه وسلم لا تبع ما ليس عندك فإنه بيع معدوم والقياس يمنع منه والصواب أنه على وفق القياس فإنه بيع مضمون في الذمة موصوف مقدور على تسليمه غالبا وهو كالمعارضة على المنافع في الإجارة وقد تقدم أنه على وفق القياس)) [اعلام الموقعين: ج٢ ص١٩]

''اس کا مطلب ہے کہ جو حضرات سلم کو خلاف قیاس سمجھتے ہیں وہ اس کو نبی ﷺ کے اس ارشاد ''جو چیز تیرے پاس موجود نہیں اس کو فروخت نہ کر۔''میں داخل سمجھنے کی غلطی کرتے ہیں جبکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ قیاس کے مطابق ہے۔کیونکہ یہ ایسی بیع ہے جس میں انسان ایسی چیز جس کو عام طور پر حوالے کرسکتا ہوتا ہے بیان کی گئی صفات کے مطابق بیچنے کی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔یہ اجارہ میں منفعت کا معاوضہ لینے جیسی صورت ہے۔اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ قیاس کے مطابق ہے۔''

سلم کی شرطیں:

اس میں ان تمام پابندیوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے جو شریعت نے عام بیع کیلیے مقرر کی ہیں تاہم معاملہ کو غرر سے پاک رکھنے کے لے کچھ خاص شرطیں بھی رکھی گئی ہیں۔مثلاً:

- جس چیز کا سودا کیا جا رہا ہو معاہدے کے وقت اس کی نوعیت،اوصاف،مقدار،تعداد اور مالیت کا تعین پہلے سے کیا جاسکتا ہو۔جن چیزوں میں یہ ممکن نہ ہو ان میں بیع سلم جائز نہیں ہوتی۔جیسے قیمتی موتی،جواہرات اور نوادرات ہیں کیونکہ ان کی اکائیاں ایک دوسرے سے کافی مختلف ہوتی ہیں۔
- جو چیز بیچی اور جو قیمت میں دی جا رہی ہو دونوں کا تعلق ان اموال سے نہ ہو جن میں

فوری قبضہ کی شرط ضروری ہے جیسے چاندی کے عوض سونے کی بیع یا گندم کے بدلے گندم کا سودا۔ کیونکہ اس قسم کے تبادلہ میں موقع پر قبضہ شرط ہے۔

❁ مکمل قیمت معاہدہ کے وقت ہی ادا کردی جائے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے۔

((مَنْ سَلَّفَ فِيْ تَمْرٍ فَلْيُسْلِفْ فِيْ كَيْلٍ مَعْلُوْمٍ، وَوَزْنٍ مَعْلُوْمٍ))

[صحیح بخاری: کتاب السلم، باب السلم فی کیل معلوم]

''جو کھجوروں میں بیع سلف کرے وہ معلوم پیمانے اور معلوم وزن میں کرے۔''

سلف سلم کا دوسرا نام ہے اور اس کو سلف اس لے کہا جاتا کہ اس میں قیمت پیشگی ادا کر دی جاتی ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں یعنی پیشگی قیمت کی شرط آپ ﷺ نے خود لگائی ہے۔ اور اگر پوری قیمت پہلے ادا نہ کی جائے تو یہ ادھار کا ادھار کے ساتھ تبادلہ ہوگا جو شرعاً ممنوع ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((وَاتَّفَقُوْا عَلَى أَنَّهُ يَشْتَرِطُ لَهُ مَا يَشْتَرِطُ لِلْبَيْعِ، وَعَلَى تَسْلِيْمِ رَأْسِ الْمَالِ فِي الْمَجْلِسِ)) [فتح الباری: ٤ ص ٥٤٠]

''علماء اس پر متفق ہیں کہ اس کی بھی وہی شرطیں ہیں جو عام بیع کی ہیں اور اس پر بھی متفق ہیں کہ مجلس میں راس المال حوالے کرنا ضروری ہے۔''

امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((هذا الشرط لا بد منه ولا يتم السلم إلا به وإلا كان من بيع الكالىء بالكالىء وقد قدمنا النهي عنه)) [السیل الجرار: کتاب البیع باب السلم]

''یہ شرط ضروری ہے اس کے بغیر سلم مکمل نہیں ہوتی ورنہ یہ ادھار کی ادھار کے ساتھ بیع ہوگی۔ اور اس کی ممانعت ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔''

❁ مدت حوالگی پوری طرح واضح ہو۔ اگر اس میں کسی قسم کا ابہام پایا جائے تو بیع سلم درست نہ ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نقل کرتے ہیں:

((أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی الله علیه و سلم نَهٰى عَنْ بَيْعِ حَبَلِ الْحَبَلَةِ ، وَكَانَ بَيْعًا يَتَبَايَعُهُ أَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ ، كَانَ الرَّجُلُ يَبْتَاعُ الْجَزُوْرَ إِلٰى أَنْ تُنْتَجَ النَّاقَةُ ، ثُمَّ تُنْتَجُ الَّتِيْ فِيْ بَطْنِهَا)) [صحیح بخاری:باب بیع الغرر وحبل الحبلة]

''بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے حاملہ کے حمل کی بیع سے منع فرمایا ہے۔(نافع کہتے ہیں) بیع کی یہ صورت زمانہ جاہلیت میں رائج تھی۔آدمی اس وعدہ پر اونٹ خریدتا کہ جب اونٹی جنے پھر وہ بڑی ہو کر جنے تب قیمت دوں گا''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

((لَا تَبَايَعُوْا إِلَى الْحَصَادِ وَالدِّيَاسِ وَلَا تَتَبَايَعُوْا إِلَّا إِلٰى أَجَلٍ مَعْلُوْمٍ))

[ارواء الغلیل: ج ٥ ص ٢١٧]

''فصل کاٹنے یا گاہنے تک بیع نہ کرو بلکہ متعین مدت تک کرو''

ان دونوں صورتوں میں چونکہ مدت میں ابہام ہے اس لیے یہ جائز نہیں ہیں۔

- مخصوص باغ یا زمین کے مخصوص قطعہ کی پیداوار میں بیع سلم نہیں ہوسکتی کیونکہ اس میں غرر پایا جاتا ہے۔ممکن ہے وہ باغ پھل نہ دے یا قطعہ زمین میں فصل ہی نہ ہو۔سعید بن سعنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا:

((هَلْ لَكَ أَنْ تَبِيْعَنِيْ تَمْرًا مَعْلُوْمًا إِلٰى أَجَلٍ مَعْلُوْمٍ مِنْ حَائِطِ بَنِيْ فُلَانٍ قَالَ لَا أَبِيْعُكَ مِنْ حَائِطٍ مُسَمًّى ، بَلْ أَبِيْعُكَ أَوْسُقًا مُسَمَّاةً إِلٰى أَجَلٍ مُسَمًّى)) [فتح الباری: ج ٤ ص:٥٤٦]

''کیا آپ مجھے بنی فلاں کے باغ سے متعین مدت کے لیے متعین کھجوریں فروخت کریں گے۔آپ نے فرمایا متعین باغ سے نہیں بلکہ متعین وسق متعین مدت کے لیے فروخت کرتا ہوں۔''

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

((وَنَقَلَ ابْنُ الْمُنْذِرِ اتِّفَاقَ الْأَكْثَرِ عَلٰى مَنْعِ السَّلَمِ فِيْ بُسْتَانٍ مُعَيَّنٍ لِأَنَّهُ غَرَرٌ)) [حوالہ مذکورہ]

''ابن منذر نے متعین باغ میں سلم کی ممانعت پر اکثر کا اتفاق نقل کیا ہے۔''

ڈاکٹر علامہ محمد سلیمان اشقر لکھتے ہیں:

''دور حاضر میں اس کی بعض صورتوں میں نظر ثانی ہونی چاہیے کیون کہ بعض بڑی بڑی فیکٹریاں ایسی ہیں جن کی مصنوعات بہت زیادہ پھیلی ہوئی ہیں اور ان کی مصنوعات میں ایسی خوبیاں ہیں جو دوسری فیکٹریوں کی مصنوعات میں نہیں پائی جاتیں۔ جیسے مرسڈیز کمپنی کی گاڑیاں یا توشیبا کے ٹیلیویژن ہیں اگر کوئی مرسڈیز گاڑی ۲۰۰ ماڈل ۱۹۹۴ء میں سلم کرنا چاہے تو یہ جائز ہونی چاہیے بلکہ میرے نزدیک گاڑیوں میں اس وقت تک سلم درست نہیں جب تک فیکٹری کا نام ذکر نہ کرے۔ صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ گاڑی پانچ سیٹر اور فلاں سال کا ماڈل ہو کیونکہ قیمتوں کے فرق کی وجہ سے اس میں جہالت پائی جاتی ہے جو نزاع کا باعث بن سکتی ہے۔ گاڑیوں کے علاوہ دوسری بڑی فیکٹریوں جن کی پیداوار بازاروں میں عام ہے کا بھی یہی حکم ہے۔ البتہ مخصوص زرعی فارم اور محدود پیداوار کے حامل کارخانے کا یہ حکم نہیں کیونکہ اس کی پیداوار بند بھی ہو سکتی ہے۔''

[بحوث فقهية في قضايا اقتصادية معاصرة: ج ۱، ص: ۱۹٤ ـ ۱۹۵]

علامہ سلیمان اشقر کے خیال میں بعض مالکی فقہاء جیسے ابن شاس اور ابن الحاجب کے کلام سے بھی اس نقطہ نظر کی تائید ہوتی ہے۔ انہوں نے متعین باغ کے پھل میں سلم ناجائز ہونے کے ساتھ یہ شرط لگائی ہے'' کہ وہ باغ چھوٹا نہ ہو'' اور جانوروں میں یہ قید لگائی ہے'' کہ ان کا تعلق ایسی نسل سے نہ ہو جو کم پائی جاتی ہو'' اس کا مطلب ہے کہ باغ اگر بڑا اور جانور کی نسل زیادہ پائی جاتی ہو تو اس میں سلم غیر متعین ہی کی طرح ہے۔

مزید لکھتے ہیں کہ بعض فقہاء کے اس کلام'' کہ بڑی بستی کے پھل میں سلم جائز ہے لیکن اگر چھوٹی ہو تو پھر جائز نہیں'' سے بھی اس کو تقویت ملتی ہے [حوالہ مذکورہ]

ملاحظہ:

شیئرز کے سودوں میں چونکہ کمپنی کا نام ذکر کرنا ضروری ہوتا ہے جس سے اس کی حیثیت متعین چیز میں سلم کی ہو جاتی ہے جو نا جائز ہے ممکن ہے جب سپردگی کا وقت آئے مارکیٹ میں اس کمپنی کے شیئرز دستیاب نہ ہوں لہذا شیئرز میں بیع سلم درست نہیں۔

سلم اور استصناع میں فرق:

استصناع کا معنی ہے آڈر پر کوئی چیز تیار کروانا۔اہلحدیث علماء کی رائے میں یہ سلم کی ہی ایک قسم ہے جس کا تعلق ایسی اشیاء سے ہے جو آرڈر پر تیار کروائی جاتی ہیں اور اس میں پابندیاں قدرے نرم ہیں۔مثلاً اس میں پوری قیمت پیشگی ادا کرنا ضروری نہیں۔ڈاکٹر علی احمد سالوس حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

((الاستصناع عند المالكية والشافعية والحنابلة جزء من السلم لا يصح الا بشروطه وهو عند الحنفية عدا زفر عقد مستقل له شروطه واحكامه الخاصة)) [موسوعة القضايا الفقهيه المعاصرة والاقتصاد الاسلامي:ص ٨٤٢]

''مالکیوں،شافعیوں اور حنبلیوں کے نزدیک استصناع سلم کی ہی قسم ہے۔جو سلم کی شرطوں کے بغیر درست نہیں ہوتی۔البتہ امام زفر کے علاوہ باقی حنفیوں کے نزدیک یہ ایک مستقل عقد ہے جس کی اپنی شرطیں اور خاص احکام ہیں۔''

سلم میں رہن اور ضمانت طلب کرنا:

بیع سلم میں بیچی گئی چیز چونکہ فروخت کنندہ کے ذمہ ادھار ہوتی ہے لہذا خریدار حوالگی یقینی بنانے کے لیے رہن یا گارنٹی کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ہم اوپر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے بیان کر آئے ہیں کہ قرآن حکیم کی آیت

﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ﴾ [البقرة:٢٨٢]

''اے ایمان والو :جب تم آپس میں مقرر وقت تک ادھار کا معاملہ کرو تو اس کو لکھ لیا کرو۔''

میں بیع سلم بھی شامل ہے جبکہ اس سے بعد والی آیت میں ادھار میں رہن کی اجازت دی گئی ہے۔یعنی سلم میں رہن کا جواز قرآن سے ثابت ہے۔امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے حق میں بایں الفاظ بَابُ الرَّهْنِ فِي السَّلَمِ ''سلم میں رہن کا ثبوت''عنوان باندھا ہے اور یہ روایت ذکر کی ہے۔اعمش رحمہ اللہ کہتے ہیں:

((تَذَاكَرْنَا عِنْدَ إِبْرَاهِيمَ الرَّهْنَ فِي السَّلَفِ فَقَالَ حَدَّثَنِي الْأَسْوَدُ عَنْ عَائِشَةَ -رضي الله عنها- أَنَّ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم اشْتَرَى مِنْ يَهُودِيٍّ طَعَامًا إِلَى أَجَلٍ مَعْلُومٍ ، وَارْتَهَنَ مِنْهُ دِرْعًا مِنْ حَدِيدٍ))

[صحیح بخاری: باب الرھن فی السلم]

''ہم نے ابراہیم کے پاس سلم میں رہن کے متعلق گفتگو کی انہوں نے فرمایا مجھے اسود نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے متعین مدت کے لے غلہ خریدا اور اس کے پاس لوہے کی زرہ گروی رکھی''

سلم میں قبضہ کی مدت:

چونکہ حدیث وسنت میں بیع سلم میں قبضہ کی کم از کم مدت کے متعلق کوئی صراحت نہیں ملتی اس لیے اس بارہ میں فقہاء کا اختلاف ہے بعض کے نزدیک ایک گھڑی کی مہلت بھی کافی ہے جبکہ بعض نصف یوم بعض دو بعض تین اور بعض پندرہ یوم کے قائل ہیں۔[عمدۃ القاری: ج ۸ص:۵۸۱]

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ کی رائے میں کم از کم اتنی مدت ہونی چاہے جس کا قیمتوں پر مناسب اثر پڑتا ہو وہ ایک مہینہ یا اس کے قریب ہے۔[المغنی ج ۶۔ص ۴۰۴]

صحیح بات یہ ہے کہ فریقین کو باہمی رضا مندی سے کوئی بھی مدت مقرر کرنے کا اختیار ہے۔

- ایک تو اس لیے کہ ذخیرہ احادیث میں نبی ﷺ سے کم از کم مدت کے متعلق کوئی روایت منقول نہیں۔
- دوسرا اس لیے کہ سلم کی اجازت کا مقصد لوگوں کو سہولت دینا ہے یہ مقصد تب ہی حاصل ہوسکتا ہے جب مدت کی پابندی نہ ہو۔

حوالگی میں تاخیر پر جرمانہ:

سلم میں بیچی گئی چیز چونکہ فروخت کنندہ کے ذمے دین (ادھار) ہوتی ہے جس میں تاخیر پر جرمانہ صریح سود شمار ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے:

((مَنْ أَسْلَفَ سَلَفًا فَلَا يَشْتَرِطْ إِلَّا قَضَاءَهُ)) [مؤطا امام مالك: باب مالا يجوز من السلف]

''جو قرض دے وہ ادائیگی کے علاوہ کوئی شرط عائد نہ کرے۔''

اسلامی بینکوں کی رہنمائی کے لیے مرتب کردہ شریعہ سٹینڈرز میں ہے.

((لَا يَجُوْزُ الشَّرْطُ الْجَزَائِيُ عَنِ التَّأْخِيرِ فِيْ تَسْلِيْمِ الْمُسْلَمِ فِيْهِ))

[ص ۱۶۲]

''جس چیز میں سلم کا سودا ہوا ہو اس کی تاخیر پر شرط جزائی جائز نہیں۔''

صفحہ ۱۷۰ میں ممانعت کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ جس چیز کا سودا ہوا ہے وہ بیچنے والے کے ذمہ دَین ہے جس پر اضافہ کی شرط سود شمار ہوتی ہے۔

اگر فروخت کنندہ تنگ دستی کی وجہ سے بروقت چیز مہیا نہ کر سکے تو اس کو فراخدستی تک موقع دیا جائے گا۔

اگر مطلوبہ چیز کی پیداوار کم ہونے یا بازار میں دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے بائع کے لیے بروقت سپردگی ممکن نہ ہو تو خریدار کے پاس دو اختیار ہوتے ہیں۔

۱۔ بازار میں آسانی سے دستیاب ہونے کا انتظار کرے۔

۲۔ سودا ختم کر کے اپنی رقم وصول کر لے۔ [المعايير الشرعية ص: ۱۶۲]

اگر عمداً تاخیری حربے استعمال کرے تو خریدار کو گارنٹی بیچنے کا بھی حق ہے، ایسی صورت میں خریدار کے پاس دو اختیار ہوں گے۔

- گارنٹی سے حاصل شدہ رقم سے اس قسم کی چیز بازار سے خرید لے۔
- یا اپنی اصل رقم وصول پالے۔

لیکن اضافی رقم خواہ جرمانے کے نام پر ہی کیوں نہ ہو وصول نہیں کی جا سکتی۔ بعض حضرات کی رائے میں اگر جرمانہ کی رقم قرض خواہ یا ادھار دینے والے کی آمدن کا حصہ نہ بنے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ رائے صائب نہیں کیونکہ شرعاً قرض یا ادھار پر مشروط اضافہ سود کے زمرہ میں داخل ہے اس میں آمدن کا حصہ بننے یا نہ بننے کی شرط نہیں۔

قبضہ سے پہلے بیچنا:

سلم کے ذریعے خریدی گئی چیز جب تک خریدار کے قبضہ میں نہ آجائے اس کو آگے فروخت کرنا منع ہے۔ کیونکہ یہ دَین ہے جس کو بیچنا شرعاً درست نہیں علاوہ ازیں احادیث میں قبضہ سے قبل فروخت کی ممانعت ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((أَمَّا بَيْعُ الْمُسْلَمِ فِيهِ قَبْلَ قَبْضِهِ ، فَلَا نَعْلَمُ فِي تَحْرِيمِهِ خِلَافًا ، وَقَدْ نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ بَيْعِ الطَّعَامِ قَبْلَ قَبْضِهِ وَعَنْ رِبْحِ مَا لَمْ يُضْمَنْ وَلِأَنَّهُ مَبِيعٌ لَمْ يَدْخُلْ فِي ضَمَانِهِ ، فَلَمْ يَجُزْ بَيْعُهُ ، كَالطَّعَامِ قَبْلَ قَبْضِهِ)) [المغنی: ج ۹ ص ۶۸]

”سلم کے ذریعے خریدی گئی چیز کو قبضہ سے قبل فروخت کرنے کی حرمت میں ہم کسی اختلاف کا علم نہیں رکھتے۔ بلاشبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبضہ سے قبل غلے کی بیع سے منع فرمایا ہے۔ اور اس چیز کے نفع سے بھی منع فرمایا ہے جس کا رسک نہ اٹھایا گیا ہو۔ اور یہ چیز تو ابھی اس کے رسک میں نہیں آئی لہٰذا اس کی بیع جائز نہیں جس طرح غلے کی قبضہ سے قبل بیع جائز نہیں۔“

نوٹ: اس چیز کی فروخت کا ایسا وعدہ جس کی پابندی دونوں یا کسی ایک فریق کے لیے

لازمی ہو وہ بھی اس ممانعت میں شامل ہیں۔

تجارت میں سلم کا استعمال:

کیا سلم کی اجازت صرف کاشتکاروں اور اشیاء تیار کرنے والوں کو ہے یا سپلائرز بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ اس بارہ میں دو نقطہ نظر ہیں۔

ا۔ اکثر علماء کی رائے میں یہ رعایت تاجروں کے لیے بھی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ بھی اسی نقطہ نظر کے حامی ہیں چنانچہ انہوں نے اس کے حق میں ''باب السلم الی من لیس عندہ أصل ''''ایسے شخص سے سلم کا معاملہ کرنا جس کے پاس اس چیز کی اصل نہ ہو'' کے عنوان سے ایک مستقل باب باندھا ہے اور استدلال کے لیے ذیل کی روایت لائے ہیں۔

((قَالَ عَبُدُ اللّٰهِ كُنَّا نُسلِفُ نَبِيطَ أَهلِ الشَّأمِ فِي الحِنطَةِ ، وَالشَّعِيرِ ، وَالزَّيتِ ، فِي كَيلٍ مَعلُومٍ ، إِلَى أَجَلٍ مَعلُومٍ قُلتُ إِلَى مَن كَانَ أَصلُهُ عِندَهُ قَالَ مَا كُنَّا نَسأَلُهُم عَن ذَلِكَ))[صحیح بخاری:باب السَّلَمِ إِلَى مَن لَيسَ عِندَهُ أَصلٌ]

''حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم شام کے کاشتکاروں کے ساتھ گندم، جو، اور تیل میں متعین پیمانے اور متعین مدت کے لے سلم کا معاملہ کرتے: محمد بن ابی مجالد رحمہ اللہ کہتے ہیں میں نے پوچھا: کیا ان سے جن کے پاس ان چیزوں کی اصل ہوتی؟ انہوں نے فرمایا: ہم ان سے اس کے متعلق نہیں پوچھتے تھے۔''

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا مطلب ہے کہ ہم ان سے یہ نہیں پوچھتے تھے کہ تمھارے پاس گندم یا جو کی فصل ہے یا نہیں؟

اس نقطہ نظر کے حق میں دوسری روایت یہ پیش کی جاتی ہے۔

((كُنَّا نُسلِفُ فِي عَهدِ رَسُولِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم وَأَبِي بَكرٍ وَعُمَرَ فِي الحِنطَةِ وَالشَّعِيرِ وَالزَّبِيبِ أَوِ التَّمرِ شَكَّ فِي التَّمرِ وَالزَّبِيبِ

وَمَا هُوَ عِنْدَهُمْ أَوْ مَا نَرَاهُ عِنْدَهُمْ)) [مسند احمد: ١٩٦٤٠]

''ہم رسول اللہ ﷺ ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں گندم، جو اور منقی یا کہا کھجوروں میں (یعنی راوی کو یہ شک ہے کہ کھجور کا لفظ بولا یا منقے کا) بیع سلم کرتے حالانکہ وہ چیز ان کے پاس نہیں ہوتی تھی یا کہا ہم وہ ان کے پاس نہیں دیکھتے تھے''

اس نقطہ نظر کے قائلین کہتے ہیں یہ روایات اس امر کا بیّن ثبوت ہیں کہ سلم کی اجازت سپلائر کے لیے بھی ہے۔

۲۔ دوسری رائے یہ ہے کہ سلم کی اجازت صرف کاشتکاروں اور مینوفیکچرز کو ہے۔ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ کاشتکار اور چیز تیار کرنے والا جب سلم کے ذریعے چیز بیچتا ہے تو غالب گمان یہی ہوتا ہے مدت حوالگی کے وقت وہ چیز اس کے پاس موجود ہوگی اس کو دوسرے سے خریدنے کی ضرورت پیش نہیں آئی گی گویا وہ اپنی ملکیتی چیز بیچ رہا ہے اس کے برعکس سپلائر جب سلم کا معاہدہ کرتا ہے تو وہ چیز اس کے پاس موجود نہیں ہوتی شریعت نے غیر ملکیتی چیز کا سودا کرنے پر پابندی لگائی ہے حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((سَأَلْتُ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ يَأْتِينِي الرَّجُلُ فَيَسْأَلُنِي الْبَيْعَ لَيْسَ عِنْدِي أَبِيعُهُ مِنْهُ ثُمَّ أَبْتَاعُهُ لَهُ مِنَ السُّوقِ))

''میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میرے پاس ایک آدمی آتا ہے وہ مجھے ایسی چیز بیچنے کو کہتا ہے جو میرے پاس نہیں ہوتی کیا میں اس کو بیچ دوں پھر وہ بازار سے خرید کر اس کو دے دوں۔''

اس پر آپ نے فرمایا:

((لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ)) [سنن النسائی:باب بَيْعِ مَا لَيْسَ عِنْدَ الْبَائِعِ]

''جو چیز تیرے پاس نہیں وہ فروخت نہ کر۔''

ان حضرات کے خیال میں حضرت حکیم رضی اللہ عنہ کا سوال تجارت میں سلم کے متعلق ہی تھا

مگر آپ نے اس کی اجازت نہ دی اور نہ ہی آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ اگر اس کی صفات بیان کر دی گئی ہوں تو پھر جائز ہے۔ ان حضرات کی تحقیق میں جو روایات اوّل الذکر فریق نے پیش کی ہیں وہ ان کے موقف کے ثبوت کے لیے ناکافی ہیں۔ پہلی روایت کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ خریدار کو فروخت کنندہ سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ آپ کے پاس کھیتی یا باغ ہے یا نہیں۔ [بحوث فی فقه المعاملات المالية: ص ١٣٤، ١٣٧، ١٣٩ للدكتور رفيق يونس المصری]

ان حضرات کی طرف سے دوسری روایت کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ جو چیز سلم میں فروخت کی جا رہی ہے اس کا معاہدے کے وقت پایا جانا ضروری نہیں جیسا کہ بعض فقہاء کی رائے ہے کہ وہ چیز معاہدہ طے پانے کے دن سے قبضہ کے دن تک بازار میں دستیاب ہو۔

جو حضرات سپلائرز کو سلم کی اجازت دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے فرمان ''جو چیز تیری ملکیت میں نہیں اس کو فروخت نہ کر'' سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تاجر سلم سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس ارشاد کا معنی صرف یہ ہے کہ ایسی متعین چیز فروخت نہ کر جو تیرے قبضہ میں نہ ہو بلکہ غیر کی ملکیت ہو۔ چنانچہ امام ابن قیم رحمہ اللہ اس کی تشریح میں رقمطراز ہیں:

((وَأَمَّا قَوْلُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِحَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ (لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ) فَيُحْمَلُ عَلَى مَعْنَيَيْنِ أَحَدُهُمَا أَنْ يَبِيعَ عَيْنًا مُعَيَّنَةً وَهِيَ لَيْسَتْ عِنْدَهُ، بَلْ مِلْكٌ لِلْغَيْرِ، فَيَبِيعُهَا ثُمَّ يَسْعَى فِي تَحْصِيلِهَا وَتَسْلِيمِهَا إِلَى الْمُشْتَرِي وَالثَّانِي أَنْ يُرِيدَ بَيْعَ مَا لَا يَقْدِرُ عَلَى تَسْلِيمِهِ وَإِنْ كَانَ فِي الذِّمَّةِ)) [اعلام الموقعين: ج ٢ ص ٤٦]

''حکیم بن حزام سے نبی ﷺ کا یہ فرمانا کہ ''جو چیز تیری ملکیت میں نہیں وہ فروخت نہ کر'' اس کو دو معنوں پر محمول کیا جائے گا۔

۱۔ انسان ایسی متعین چیز بیچے جو اس کے پاس موجود نہ ہو بلکہ غیر کی ملکیت ہو۔ آدمی پہلے

اس کو بیچے پھر حاصل کر کے مشتری کے حوالے کرنے کی کوشش کرے۔

۲۔ ایسی چیز کا سودا کرے جس کو (مشتری کے) حوالے نہ کر سکتا ہو خواہ ذمہ داری اٹھائے۔"

بیع سلم میں دونوں باتیں نہیں ہوتیں کیونکہ یہاں تو صرف بیان شدہ صفات کے مطابق ایک چیز فروخت کرنے کی ذمہ داری قبول کی جاتی ہے۔

اسلامی بینکوں میں سلم کا استعمال:

بلا شبہ سلم ایک بہترین غیر سودی طریقہ تمویل ہے جو عصر حاضر میں بھی لوگوں خصوصا کاشتکاروں اور مینوفیکچرز کی مالی ضرورتیں پوری کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے اور بعض اسلامی بینک اس سے فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں اسلامی بینک اس کی عملی تطبیق میں گڑبڑ کرتے ہیں جس سے یہ معاملہ شرعی اصول کے مطابق نہیں رہتا۔ وہ یوں کہ گنے کے سیزن میں شوگر ملوں کو گنا خریدنے کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملز مالکان چاہتے ہیں کہ ہمارا مقصد بھی پورا ہو جائے اور ہم سود سے بھی محفوظ رہیں اب وہ اسلامی بینک کی طرف رجوع کرتے ہیں بینک اس شرط پر رقم فراہم کرتا ہے کہ آپ نے ہمیں اس کے عوض فلاں تاریخ تک اتنی چینی مہیا کرنی ہے یعنی بینک سلم کا معاہدہ کر لیتا ہے شوگر ملز کی طرف سے فراہمی یقینی بنانے کے لیے بینک ضمانت بھی طلب کرتا ہے چونکہ بینک کاروباری ادارہ نہیں جو آگے بیچنے کے لے گاہک تلاش کرتا پھرے اس لیے معاہدے کے وقت ہی یہ بھی طے کر لیا جاتا ہے کہ مل مالک بینک کے وکیل کی حیثیت سے یہ چینی مارکیٹ میں اس قیمت پر فروخت کر کے رقم بینک کے سپرد کرے گا۔ بعض دفعہ معاہدے کے وقت اس کی صراحت نہیں ہوتی مگر فریقین کے ذہن میں یہی ہوتا ہے۔ اگر شوگر مل بروقت چینی فراہم نہیں کرتی تو بینک دی گئی رقم کے فیصد کے حساب سے جرمانہ وصول کرتا ہے جو بینک کی زیر نگرانی قائم خیراتی فنڈ میں جمع کروایا جاتا ہے۔

بینک کا خود قبضہ کرنے کی بجائے فروخت کنندہ کو ہی وکیل بنانا شرعی اصول کے خلاف ہے۔

چنانچہ علماء احناف کے سرخیل علامہ سرخسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((وَلَوْ قَالَ رَبُّ السَّلَمِ لِلْمُسْلَمِ إِلَيْهِ كُلُّ مَا لِيُ عَلَيْكَ مِنَ الطَّعَامِ فَاعْزِلْهُ فِيُ بَيْتِكَ أَوْ فِيُ غَرَائِرِكَ فَفَعَلَ ذٰلِكَ لَمْ يَكُنُ رَبُّ السَّلَمِ قَابِضًا بِمَنْزِلَةِ قَوْلِهِ اقْبِضْهُ لِيُ بِيَسَارِكَ مِنُ يَمِيْنِكَ وَهٰذَا لِأَنَّ الْمُسْلَمَ فِيُهِ دَيْنٌ عَلَى الْمُسْلَمِ إِلَيْهِ وَالْمَدْيُوْنُ لَا يَصْلُحُ أَنُ يَكُوْنَ نَائِبًا عَنُ صَاحِبِ الدَّيْنِ فِيُ قَبْضِ الدَّيْنِ مِنُ نَفْسِهِ)) [المبسوط: ج۱۵ ص۱۰۱]

''اس کا مطلب یہ ہے کہ سلم کے ذریعے بیچی گئی چیز فروخت کنندہ کے ذمہ ادھار ہوتی ہے اور جس کے ذمہ ادھار ہو وہ خود اپنی ذات سے اس کی وصولی کے لیے اس شخص کا وکیل نہیں بن سکتا جس کا اس کے ذمہ ادھار ہو۔''

علامہ ڈاکٹر محمد سلیمان اشقر سلم سے اسلامی بینکوں کے فائدہ اٹھانے کے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((الطريقة الثانية: أن يوكل المصرف البائع(المسلم اليه) بتسويق البضاعة بأجر أو دون أجر فأن كان باتفاق معه مسبق مربوط بعقد السلم نفسه فان ذالك باطل لا يجوز،لأنه من باب جمع عقدين فى عقد واحد .وكذا لو كان الأمر متفاهما عليه أن يتم بهذه الصورة.))

[بحوث فقيهةفى قضايا اقتصادية معاصرة: ج۱ ص:۲۱٤]

''دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بینک چیز کی مارکیٹنگ کے لیے فروخت کنندہ کو ہی اپنا وکیل مقرر کر دے خواہ اس کی اجرت دے یا نہ دے۔ تو اگر یہ وکالت پہلے سے عقد سلم سے مربوط ایگر یمنٹ کے ذریعے ہو تو یہ عمل باطل ہوگا جو جائز نہیں کیونکہ یہ ایک عقد میں دو عقد جمع کرنے کے مترادف ہے اور اگر (ایگریمنٹ تو نہ ہو مگر) پہلے ہی سے ذہن میں یہ ہو کہ معاملہ اس طرح تکمیل کو پہنچے گا تو پھر بھی یہ جائز نہیں۔

سلم متوازی:

یہاں یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی بینکوں میں سلم سے فائدہ اٹھانے

کا جو طریقہ اسلامی بینکنگ کے ماہرین نے تجویز کیا ہے اس کو سلمِ متوازی کہتے ہیں۔یعنی بینک کسی تیسرے فریق کے ساتھ سلم کا معاہدہ کرلے۔جس کی تاریخِ ادائیگی پہلی سلم والی ہی ہو۔متوازی سلم میں مدت کم ہونے کی وجہ سے قیمت زیادہ ہوگی اور یوں دونوں قیمتوں میں فرق بینک کا نفع ہوگا۔مگر ہمارے ہاں اسلامی بینکوں میں یہ طریقہ شاذ و نادر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔زیادہ تر فروخت کنندہ کو ایجنٹ بنانے کا طریقہ ہی اختیار کیا جاتا ہے۔جو شرعاً درست نہیں۔

پراپیگنڈہ کا جواب:

مروجہ اسلامی بینکوں کے حامی یہ پراپیگنڈہ بھی کرتے ہیں کہ اسلامی بینکوں نے شریعہ ایڈوائزر رکھے ہوئے ہیں جو تمام امور کی نگرانی کرتے ہیں اگر اسلامی بینکوں میں شرعی اصولوں کا پورا خیال نہیں رکھا جاتا تو وہ تائید کیوں کرتے ہیں۔ہم اس کے جواب میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے اسلامی بینکاری کے حامی اور متحدہ عرب امارات میں Emirates Islamic Bank کے شریعہ بورڈ کے ممبر جناب عبدالعظیم ابوزید کے ایک بیان کا حوالہ دینا کافی سمجھتے ہیں جو ۱۵ اپریل ۲۰۰۸ء کو I.B.F Net پر شائع ہو چکا ہے۔اس کے مطابق انہوں نے دبئی میں اسلامک فنانس فورم میں تقریر کرتے ہوئے واضح الفاظ میں کہا کہ شریعہ سکالر کرپٹ ہو چکے ہیں اور بینک صرف انہیں کے پاس جاتے ہیں جو ان کے حق میں ہوتے ہیں انہوں نے Arabian Business.Com کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ اسلامک فنانس

سیکٹر خطرے میں ہے۔انہوں نے کہا کہ بینک کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ نفع کمانا اس لحاظ سے کنونشنل اور (رائج) اسلامک فنانس میں کوئی فرق نہیں۔

خلاصہ

مذکورہ بالا تفصیل سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

- مروجہ اسلامی بینکاری سودی بینکاری کا ہی چربہ ہے مگر تاویلات کے ذریعے اس کو جائز

ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی جارہی ہے۔

- اسلامی بینکوں میں رائج مضاربہ، اجارہ، مرابحہ، مشارکہ متناقصہ، تورق اور سلم شرعی مضاربہ، اجارہ اور مرابحہ وغیرہ سے مختلف ہیں۔
- اسلامی بینکوں کی کوئی بھی پراڈکٹ شرعی اصول سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ لہٰذا ان سے احتراز واجب ہے۔

❀❀❀

باب پنجم

تکافل

مروجہ اسلامی انشورنس

کچھ عرصہ سے بعض مالیاتی ادارے اسلامی بینکوں کی طرز پر سود، غرر اور قمار پر مشتمل انشورنس کا متبادل نظام بڑے زور و شور سے متعارف کرا رہے ہیں جس کو تکافل کا نام دیا گیا ہے۔ جو ادارہ اس کا انتظام و انصرام کرتا ہے اس کو تکافل کمپنی کہا جاتا ہے جیسے پاک کویت جنرل تکافل کمپنی یا پاک قطر فیملی تکافل کمپنی وغیرہ۔ ان کمپنیوں کے بقول یہ نظام چونکہ ہر لحاظ سے شرعی اصولوں کے عین مطابق ہے اس لیے اس کو اسلامی انشورنس بھی کہا جاتا ہے۔ چونکہ اس کام سے ان اداروں کی غرض نفع کمانا ہے اس لیے ہم اس کو تجارتی تکافل بھی کہہ سکتے ہیں۔ تکافل کا مفہوم اور شرعی تصوّر کیا ہے شرعی اور تجارتی تکافل میں بنیادی فرق کیا ہے نیز تجارتی تکافل کی شرعی اساس اور حکم کیا ہے؟ ذیل میں ان سوالوں کے جوابات ملاحظہ فرمائیں۔

تکافل کا معنی و مفہوم:

ہماری معلومات کے مطابق قرآن و حدیث اور لغت کی قدیم کتب میں تکافل کا لفظ مذکور نہیں ہاں کتاب و سنت میں ایسے الفاظ ضرور استعمال ہوئے ہیں جن کا مادہ وہی ہے جو تکافل کا ہے یعنی ''ک ف ل'' سے بنے ہیں۔ مثلاً قرآن حکیم میں حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت اور تربیت کے حوالے سے ایک جگہ:

﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا﴾

[آل عمران:٣٧]

''پھر اس کے رب نے اسے قبول کیا قبول کرنا اچھا اور زکریا کو اس کا کفیل بنایا۔''

اور دوسری جگہ:

﴿إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ﴾ [آل عمران: ٤٤]

''جب وہ اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی کفالت کرے۔''

یعنی پہلی آیت میں لفظ ''كَفَّلَ کفیل'' بنایا اور دوسری میں ''يَكْفُلُ'' کفالت کرے، کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

جب دو آدمی دیوار پھلانگ کر حضرت داؤد علیہ السلام کے کمرہ میں داخل ہوئے تو ان میں سے ایک نے کہا:

﴿إِنَّ هَـٰذَا أَخِي لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَعْجَةً وَلِيَ نَعْجَةٌ وَاحِدَةٌ فَقَالَ أَكْفِلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ﴾ [ص: ٢١]

''بے شک یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی دنبی ہے تو یہ کہتا ہے وہ بھی میرے سپرد کردے اور گفتگو میں مجھ پر غالب آجاتا ہے''

یہاں ''أَكْفِلْ سپرد کردے'' کا لفظ آیا ہے۔

اسی طرح حدیث میں بھی اس مادہ کے مختلف الفاظ آئے ہیں۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

((أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيمِ فِي الْجَنَّةِ هَكَذَا)) [صحيح بخاري: كتاب الادب، باب فضل من يعول]

''میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح اکٹھے ہوں گے آپ نے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا جیسے یہ دونوں اکٹھی ہیں''

البتہ لغت کی جدید کتب میں یہ لفظ زیر بحث آیا ہے۔ چنانچہ المورد میں تکافل کا معنی: Joint liability or responsibility;solidarity ''مشترکہ ذمہ داری یا جواب دہی؛ باہمی اتفاق؛ مقاصد اور عمل کا اتحاد'' لکھا ہے۔

معجم الطلاب میں ہے:

((تَكَافَلَ يَتَكَافَلُ،تكافُلا:تَضَامَنَ/تبادَلَ الضمانةَمَع غَيرِهِ))

''دوسرے کے ساتھ گارنٹی کا تبادلہ کرنا۔''

معجم لغة الفقهاء میں تکافل کا معنی ومفہوم یوں بیان ہوا ہے:

((تبادل الاعالة و النفقة و المعونة (Solidarity) الرعاية والتحمل،و منه تكافل المسلمين رعاية بعضهم بعضا بالنصح والنفقة وغير ذلك))

''کفالت،نفقہ اور اعانت کا تبادلہ(انگریزی میں سولیڈریٹی)خیال رکھنا اور برداشت کرنا اور اسی سے تکافل المسلمین ہے۔یعنی مسلمانوں کا ایک دوسرے کا خیر خواہی اور خرچ وغیرہ کر کے خیال رکھنا۔''

اسلام میں تکافل کی اہمیت:

اگرچہ قرآن وحدیث میں لفظ تکافل ذکر نہیں ہوا مگر ایک دوسرے کی ضرورتوں کا خیال رکھنا،خیر خواہی اور تعاون کرنا دین کا اہم مطالبہ ہے۔سید قطب شہید رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((ان التكافل الاجتماعي هو قاعدة المجتمع الاسلامي و الجماعة المسلمة مكلفة أن ترعى مصالح الضعفاء فيها))

[فی ظلال القرآن: ج۱ ص۲۱۲]

'' بلا شبہ اجتماعی تکافل ہی اسلامی معاشرہ کی بنیاد ہے اور مسلمانوں کی جماعت پابند ہے کہ وہ اپنے کمزوروں کے مفادات کا خیال رکھے۔''

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

((كان النظام الاسلامي كله يقوم على اساس التكافل))

[ج۳ص:۴۳۳]

''اسلام کا مکمل نظام تکافل کی بنیاد پر قائم ہے''

ذیل میں اس موضوع کی بعض آیات اور احادیث نبویہ ﷺ ملاحظہ ہوں:

﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝﴾[التوبة:٧١]

''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں وہ نیکی کا حکم دیتے اور برے کام سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے اور زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالی ضرور رحم فرمائے گا بے شک اللہ تعالی نہایت غالب خوب حکمت والا ہے۔''

یعنی اہل ایمان کا شعار یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں۔تکافل کی روح بھی یہی ہے۔

علامہ محمد رشید رضا رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

((ولاية المؤمنين والمؤمنات بعضهم لبعض في هذه الآية تعم ولاية النصرة،وولايةالأخوة والمودة)) [تفسير المنارج: ١٠ ـ ص ٤٧٠]

''اس آیت میں مومن مردوں اور مومن عورتوں کی جس دوستی کا ذکر ہے وہ نصرت، اخوت اور محبت سب دوستیوں کو شامل ہے۔''

- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے اچانک ایک شخص اپنی سواری پر آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا یعنی اپنی ضرورت کی چیز تلاش کرنے لگا اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ مَعَهُ فَضْلُ ظَهْرٍ فَلْيَعُدْ بِهِ عَلَى مَنْ لَا ظَهْرَ لَهُ وَمَنْ كَانَ لَهُ فَضْلٌ مِنْ زَادٍ فَلْيَعُدْ بِهِ عَلَى مَنْ لَا زَادَ لَهُ))[صحيح مسلم: كتاب اللقطة،باب استحباب المؤاساة بفضول المال]

''جس کے پاس زائد سواری ہے وہ اس کو دے دے جس کے پاس سواری نہیں ہے

اور جس کے پاس زائد راشن ہو وہ اس کو دے دے جس کے پاس راشن نہیں ہے۔ راوی کہتے ہیں آپ ﷺ نے مال کی جو اصناف ذکر کی سو کی یہاں تک کہ ہم نے یہ سمجھا کہ زائد میں ہم میں سے کسی کا حق نہیں ہے۔''

اسلام کہتا ہے اگر ایک مسلمان کو تکلیف ہو تو دنیا بھر کے مسلمان اس وقت تک بے چین رہیں جب تک اس کی تکلیف رفع نہ ہو جائے۔ آپ ﷺ نے بڑی عمدہ مثال بیان کر کے اس کو یوں سمجھایا:

((تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادِّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكَى عُضْوًا تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ جَسَدِهِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمَّى))

[صحيح بخاری: كتاب الادب، باب رحمة الناس و البهائم]

''تو مسلمانوں کو ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت رکھنے اور شفقت کرنے میں ایک جسم کی مانند دیکھے گا اگر ایک عضو بیمار ہو جاتا ہے تو تمام اعضاء بخار اور بیداری میں اس کے شریک ہوتے ہیں۔''

ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا اللہ کی قسم اگر اللہ تعالی یہ قحط ختم نہ کرتے:

((مَا تَرَكْتُ أَهلَ بَيتٍ مِن المُسلمين لَهم سِعةٌ إِلا أَدخلتُ مَعهم أَعدادَهُم مِن الفُقراء)) [الاداب المفرد: باب المواساة فی السنة و المجاعة]

''میں ہر صاحب حیثیت مسلمان گھرانے میں اتنے ہی غرباء داخل کر دیتا۔''

یعنی ایک خوشحال خاندان میں جتنے افراد ہوتے اتنے ہی غرباء کی کفالت ان پر لازم ہوتی۔

اسلامی تکافل کی ہمہ گیریت:

اسلام کا نظام تکافل اسلامی اخوت، معاشی احتیاج وضرورت اور تکریم انسانیت پر استوار ہے۔ اسلام اس سوچ کا قطعا حامی نہیں کہ ہم پر صرف ان مستحقین کی ذمہ داری عائد

ہوتی ہے جو ہمارے ہم عقیدہ ہوں۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝﴾ [الممتحنة:٨]

''اللہ تعالیٰ تمھیں ان لوگوں سے حسن سلوک کرنے اور ان کے حق میں انصاف کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے دین کی بابت نہیں لڑے اور جنہوں نے تم کو تمھارے گھروں سے نہیں نکالا۔ بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((فِيْ كُلِّ ذَاتِ كَبِدٍ رَطْبَةٍ أَجْرٌ)) [صحيح بخاري: كتاب المظالم باب الآبار على الطرق إذا لم يتأذ بها]

''ہر جاندار میں ثواب ہے'' یعنی ہر جاندار کے ساتھ احسان کرنا باعث ثواب ہے۔''

فقہائے اسلام کی رائے میں جو اہل ذمہ اپنے معاش کے حصول سے عاجز ہو جائیں ان کی ضرورت کے مطابق بیت المال سے وظیفہ جاری کیا جائے گا۔ چنانچہ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ قمطراز ہیں:

((قد روى عنه وأنه أجرى على شيخ منهم من بيت المال، و ذالك أنهمر به و هو يسأل على الابواب .و فعله عمر بن عبدالعزيز))

[احكام اهل الذمة ،باب من لا يقدر من اهل الذمة أعطى من بيت المال]

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک ذمی بوڑھے کو دروازوں پر مانگتے دیکھا تو بیت المال سے اس کا وظیفہ جاری کر دیا اور عمر بن عبدالعزیز نے بھی ایسا کیا تھا''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اہل حیرہ سے کہا تھا تم میں سے جو بوڑھا ہو جائے گا یا جس پر کوئی آفت آجائے گی یا جو مالدار رہنے کے بعد غریب ہو جائے گا وہ جب تک دارالاسلام میں رہے گا اس کی اور اس کے بیوی بچوں کی کفالت بیت المال کرے گا۔'' [کتاب الخراج قاضی ابو یوسف]

ثابت ہوا اسلام کے نظام تکافل کا فیض انتہائی وسیع ہے جس سے اسلامی ریاست کا ہر مستحق شہری بلا تخصیص عقیدہ بقدر ضرورت مستفید ہوتا ہے۔

تکافل کی مختلف صورتیں:

اسلامی نقطہ نظر کے مطابق درجات معیشت میں تفاوت اپنی جگہ مگر اس طرح سادہ زندگی گزارنے کا حق سب کو یکساں ہے کہ اس کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ اس امر کو یقینی بنانے کے لیے زکوۃ، عشر اور صدقہ فطر وغیرہ کا نظام دیا گیا ہے۔ اور معاشرہ میں دولت کو زیر گردش لانے اور غرباء کی بہبود میں زکوۃ کا کردار بڑا نمایاں ہے۔ سید قطب شہید رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((ان الزكاة فرع من فروع نظام التكافل الاجتماعي في الاسلام)) [في ظلال القرآن: ج٤۔ص٤١]

''زکوٰۃ اسلام میں تکافل اجتماعی کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔''

رمضان المبارک کے اختتام پر صدقہ فطر بھی تکافل اجتماعی کی ایک شکل ہے تاکہ چھوٹے سے لے کر بڑے تک ہر شخص فقراء ومساکین کی دیکھ بھال میں حصہ دار بنے مالداروں کو فقراء اقرباء کے نان ونفقہ کا ذمہ دار ٹھہرانا بھی تکافل میں شامل ہے جبکہ نفلی صدقات اور ہنگامی حالات میں انفاق کا حکم الگ ہے۔ اسی طرح غیر ارادی طور پر قتل ہو جانے کی صورت میں دیت تنہا قاتل پر ڈالنے کی بجائے عاقلہ (قاتل کے بھائی، چچا اور ان کی اولاد) کو بھی شریک کرنے کا حکم تکافل کی ہی عکاسی کرتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ اس کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

((وَالْمَعْنَى فِي ذَلِكَ أَنَّ جِنَايَاتِ الْخَطَأِ تَكْثُرُ، وَدِيَةَ الْآدَمِيِّ كَثِيرَةٌ، فَإِيجَابُهَا عَلَى الْجَانِي فِي مَالِهِ يُجْحِفُ بِهِ، فَاقْتَضَتِ الْحِكْمَةُ إِيجَابَهَا عَلَى الْعَاقِلَةِ، عَلَى سَبِيلِ الْمُوَاسَاةِ لِلْقَاتِلِ، وَالْإِعَانَةِ لَهُ، تَخْفِيفًا عَنْهُ)) [المغني: ج١٢۔ ص٢١]

''اس میں حکمت یہ ہے غیر ارادی طور پر ہونے والے جرائم بکثرت ہوتے ہیں اور آدمی کی دیت بھی کافی زیادہ ہے۔لہٰذا اس کو اکیلے خطا کار کے مال میں واجب قرار دینا اس پر اس کے مال میں ناقابل برداشت ذمہ داری ڈالنے کا باعث ہے چنانچہ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ قاتل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے بطور ہمدردی اور اعانت کے اس کی عاقلہ پر واجب قرار دی جائے۔''

بلکہ غیر ارادی قتل میں دیت کا حکم بذات خود تکافل کی ایک صورت ہے وہ یوں کہ بعض دفعہ مقتول کے بچے کمسن ہوتے ہیں جن کی تعلیم وتربیت کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے اسلام نے دیت مقرر کر کے ان کی کفالت کا انتظام کیا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ اسلام نے تکافل کا ایک مضبوط نظام دیا ہے اگر اس پر عمل ہو جائے تو تمام محتاجوں کی معاشی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں۔لیکن بایں ہمہ اگر ضرورت پوری نہ ہو تو سرمایہ داروں پر مزید خرچ کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

اسلامی تکافل کی خصوصیت:

اسلامی تکافل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا بنیادی مقصد اپنے مستقبل کے خطرات کا تحفظ اور نقصانات کی تلافی ہرگز نہیں۔اور نہ ہی اس کو بطور کاروبار اختیار کیا جانا چاہیے اسلامی معاشرے کا یہ شعار ہونا چاہیے کہ اس کے تمام افراد باہم مددگار و معاون ہوں اور ضرورت مندوں اور مجبوروں کی مدد کریں لیکن اگر کچھ ادارے تکافل کے نام سے یہ مطالبہ کریں کہ ہم آپ کے بیوی بچوں کی مدد تب کریں گے جب آپ اتنے سالوں تک ہر ماہ ایک متعین رقم ہمیں وکالہ یا مضاربہ کی بنیاد پر کاروبار اور وقف فنڈ میں بطور چندہ دیں گے تو اس سے اسلام کے تکافل اجتماعی کا مقصد حاصل نہیں ہوگا۔

مروجہ تکافل اور اس کا طریقہ کار:

ماضی قریب میں تکافل کی ایک نئی شکل سامنے آئی ہے جس کا مقصد دوسروں کے ساتھ تعاون کی بجائے دراصل اپنے نقصان کا ازالہ ہوتا ہے اور اس کے منتظم بھی یہ کام بطورِ

کاروبار کرتے ہیں۔اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ

- سب سے پہلے کچھ لوگ یا مالیاتی ادارے مل کر ایک کمپنی قائم کرتے ہیں جس کو تکافل کمپنی کہا جاتا ہے کمپنی کے اداشدہ سرمایہ کا ایک حصہ وقف کر کے ایک پول بنایا جاتا ہے یہ پول کسی کی ملکیت نہیں ہوتا بلکہ اپنا الگ قانونی وجود رکھتا ہے کمپنی کی طرف سے پول میں ڈالی گئی رقم ان متاثرین کے لیے وقف ہوتی ہے جو پالیسی حاصل کرتے ہیں۔
- کمپنی مالکان وقف کی اس رقم کو وقف کے ایجنٹ کی حیثیت سے یا مضاربہ کی بنیاد پر کاروبار میں لگاتے ہیں نفع سے اپنی فیس یا حصہ الگ کر کے باقی دوبارہ وقف پول میں ہی جمع کر دیا جاتا ہے۔
- کمپنی لوگوں کو پالیسی حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہے جو لوگ پالیسی حاصل کرتے ہیں وہ اس کے ممبران شمار ہوتے ہیں۔
- پالیسی حاصل کرتے وقت خواہش منداپنی اغراض پیش نظر رکھتے ہیں۔کسی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ میری موت کے بعد میرے بچوں کی کفالت کے لیے ان کے پاس بیس لاکھ ہونا چاہیے۔کسی کے پیش نظر خاص قسم کے متوقع نقصان کا ازالہ کرنا ہوتا ہے۔
- صرف وہی لوگ پالیسی حاصل کرنے کے اہل شمار ہوتے ہیں جو عمر وصحت اور انکم کے لحاظ سے کمپنی کے معیار پر پورا اترتے ہیں۔باقاعدہ طبی معائنہ کے ذریعہ ایک اندازہ کیا جاتا ہے۔اگر کسی چیز کے متوقع نقصان کی تلافی مقصود ہو تو اس چیز کی حالت بھی دیکھی جاتی ہے۔
- پالیسی کی زیادہ سے زیادہ مالیت کیا ہوگی یہ فیصلہ خواہشمند نے خود کرنا ہوتا ہے۔کم از کم مالیت تکافل کمپنی طے کرتی ہے۔
- پالیسی کی زیادہ سے زیادہ مدت کمپنی طے کرتی ہے البتہ کم سے کم مدت کا تعین وہ شخص خود بھی کر سکتا ہے۔یاد رہے کمپنی کی جانب سے پالیسی ہولڈر کو دی جانیوالی رقم کا

انحصار انہی دو باتوں پر ہوتا ہے۔

- چونکہ تکافل فنڈ کا انتظام وانصرام کمپنی کے ذمہ ہوتا ہے کمپنی اس کی باقاعدہ فیس لیتی ہے جس کو وکالہ فیس کہا جاتا ہے۔
- پالیسی کی رقم عموماً سالانہ اقساط میں جمع کروائی جاتی ہے جبکہ ششماہی یا سہ ماہی اقساط میں بھی کروائی جاسکتی ہے۔
- پالیسی ہولڈر کی قسط سے سب سے پہلے ایلوکیشن فیس منہا کی جاتی ہے یہ فیس پالیسی مالیت اور مدت کو مدنظر رکھ کر لی جاتی ہے پہلی قسط سے ایک خطیر رقم اس مد میں چلی جاتی ہے۔مثلاً اگر پالیسی کی مدت ۲۰ سال یا اس سے زیادہ ہو اور قسط پندرہ سے پچیس ہزار تک ہو تو پاک قطر فیملی تکافل پہلی سالانہ قسط سے ۸۰ دوسری سے ۲۰ تیسری سے ۱۰ چوتھی سے ۷ پانچویں سے بھی ۷ چھٹی سے لے کر دسویں تک تین فیصد وصول کرتی ہے۔
- ایلوکیشن فیس کے بعد ہر قسط کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ایک حصہ انوسٹمنٹ کیلئے اور دوسرا حصہ وقف پول کے لیے۔
- جو حصہ انوسٹمنٹ کے لیے ہوتا ہے اس سے دو قسم کی فیس کاٹی جاتی ہے۔

۱۔ ایڈمن فیس: یہ ماہانہ اور پالیسی کی مالیت اور مدت کے اعتبار مختلف مگر فکسڈ ہوتی ہے۔ مثلاً پاک قطر فیملی تکافل کی کم از کم ۶۵ روپے اور زیادہ سے زیادہ ایک سو دس ماہانہ ہے اس میں سالانہ آٹھ فیصد اضافہ بھی ہوتا ہے۔

۲۔ مینجمنٹ انوسٹمنٹ فیس: پاک قطر فیملی تکافل کمپنی کی تقریباً ڈیڑھ فیصد ہے۔

- جنرل تکافل میں مکمل قسط وقف پول میں جمع ہوتی ہے۔کمپنی وقف کو منظم کرنے اور اس کے سرمایہ سے کاروبار کرنے کی علیحدہ علیحدہ فیس لیتی ہے۔
- ہر تکافل کمپنی کا ایک دوسری کمپنی جس کو ری تکافل کہا جاتا ہے سے معاہدہ ہوتا ہے تکافل کمپنی پالیسی ہولڈر کی قسط کا کچھ حصہ ری تکافل کمپنی کو بھی دیتی ہے۔

- جو حصہ وقف پول میں جمع ہوتا ہے وہ پالیسی ہولڈرز کی ملکیت سے نکل کر وقف کی ملکیت میں چلا جاتا ہے تاہم تجارتی تکافل کے حامیوں کے مطابق وہ خود وقف نہیں ہوگا صرف وقف کی ملکیت ہوگا جو وقف کے مصالح اور ان لوگوں پر خرچ ہوگا وقف کی مد میں شامل ہونگے۔ ملاحظہ ہو مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کا مقالہ "تأصيل التأمين التكافلي على أساس الوقف و الحاجة الداعية اليه" ص: ۱۸۔۲۰
- کمپنی ان دونوں کھاتوں میں جمع شدہ رقم سے پالیسی ہولڈرز اور وقف پول کے ایجنٹ کی حیثیت سے کاروبار کرتی ہے جو نفع ہو وہ وقف پول اور پالیسی ہولڈرز کے کھاتے میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ وقف پول کا مکمل نفع وقف پول میں ہی جاتا ہے۔
- کلیمز کی ادائیگی میں عموماً سرمایہ دارانہ انشورنس کی شرطوں کو ہی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اگر کلیمز زیادہ ہونے کیوجہ سے وقف پول میں رقم کم پڑ جائے تو قانوناً کمپنی اس بات کی پابند ہوتی ہے کہ وہ قرض حسنہ لیکر باقی کلیمز ادا کرے۔ یہ قرض خود کمپنی ہی وقف پول کو دیتی ہے جو اس نے آئندہ سرپلس سے وصول پانا ہوتا ہے۔
- اگر پالیسی ہولڈر بیماری یا حادثے کی وجہ سے قسط ادا کرنے کے قابل نہ رہے تو وہ کمپنی ادا کرتی ہے بشرطیکہ شروع میں یہ فیصلہ کر لیا جائے کیونکہ اس کے لیے اضافی رقم ادا کرنا لازم ہوتی ہے۔

مروجہ تکافل کی قسمیں:

اس کی بنیادی قسمیں دو ہیں:

۱۔ فیملی تکافل۔

۲۔ جنرل تکافل۔

فیملی تکافل:

یہ اصطلاح لائف انشورنس کے متبادل استعمال ہوتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ پالیسی ہولڈر کی ہر قسط کا کچھ انوسٹمنٹ کھاتے میں جاتا ہے اور کچھ حصہ وقف پول میں۔

یہاں کمپنی دو قسم کی الگ الگ ایجنسی فیس وصول کرتی ہے ایک وقف پول کا منتظم ہونے کی حیثیت سے یہ وقف پول سے لی جاتی ہے اور دوسری پالیسی ہولڈر کا ایجنٹ ہونے کی حیثیت سے یہ پالیسی ہولڈر کے کھاتے سے کاٹی جاتی ہے۔

اب اگر پالیسی ہولڈر متعینہ مدت سے پہلے فوت ہو جائے تو کمپنی اس کے ورثاء کو ایک تو انوسٹمنٹ اکاؤنٹ میں سے پالیسی حاصل کرنے کی ابتداء سے لے کر فوت ہونے تک جمع کرائی گئی رقم مع اس نفع کے جو سرمایہ کاری سے حاصل ہوا ادا کریگی۔اور دوسرا فوت ہونے کی وجہ سے پالیسی ہولڈر کے ذمہ جو اقساط رہ گئیں ہیں وہ وقف پول سے ادا کریگی اور اگر پالیسی ہولڈر متعینہ مدت تک زندہ رہے تو پھر اس کو حسب ذیل فوائد حاصل ہونگے۔

- انوسٹمنٹ کھاتے میں جمع شدہ رقم مع اس نفع کے جو اس دوران سرمایہ کاری سے حاصل ہوا۔
- وقف میں دیے گئے عطیہ کے تناسب سے حصہ بشرطیکہ وقف پول میں سرپلس ہو۔

لیکن اگر کوئی شخص مدت مکمل ہونے سے قبل پالیسی سے نکلنا چاہے تو وہ صرف اپنی انوسٹمنٹ کھاتے میں موجود رقم اور اس سے حاصل ہونے والے نفع کا حق رکھتا ہے وقف پول میں دی گئی رقم پر اس کا کوئی حق نہیں ہوتا۔

جنرل تکافل:

یہ اصطلاح جنرل انشورنس کی جگہ بولی جاتی ہے۔یعنی ممکنہ خطرات سے تحفظ کی پالیسی اس میں قسط کی پوری رقم وقف پول میں جاتی ہے۔اگر دوران مدت وہ نقصان ہو جائے جس کی تلافی کے لیے پالیسی لی گئی ہے تو ازالہ کر دیا جاتا ہے۔بصورت دیگر سرمایہ دارانہ نظام انشورنس کی طرح پالیسی ہولڈر کو کچھ نہیں ملتا۔البتہ کمپنی اپنی صوابدید پر کچھ بونس دے سکتی ہے۔

کیا مروجہ تکافل سود اور غرر سے پاک ہے؟

کمرشل انشورنس کو جن خرابیوں کی بنیاد پر حرام قرار دیا گیا ہے ان میں سرفہرست سود اور غرر (Uncertainty) ہے بادیٔ النظر میں یہ دونوں خرابیاں یہاں بھی پائی جاتیں

ہیں۔ وہ یوں کہ اگر پالیسی ہولڈر مدت پوری ہونے سے پہلے فوت ہو جائے تو اس کو پالیسی کے تحت طے شدہ رقم دی جاتی ہے، جس کا ایک حصہ اس نے ادا ہی نہیں کیا ہوتا۔

اور کمپنی قانونی طور پر اس کی پابند بھی ہوتی ہے۔ جبکہ غرر اس طرح کہ دونوں احتمال ہیں ممکن ہے جس نقصان کے ازالہ کے لیے پالیسی لی گئی ہے وہ پیش نہ آئے اور ادا کی ہوئی رقم رائیگاں جائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ وہ پیش آ جائے اور کمپنی کے ذمہ ادائیگی لازم ہو جائے۔

کیا یہ عقد معاوضہ نہیں؟

تجارتی تکافل کے حامی کہتے ہیں کہ اضافہ اور غرر تب ممنوع ہے جب عقد معاوضہ (لین دین کی وہ صورت جس میں ایک فریق دوسرے سے معاوضہ لینے کا حق رکھتا ہے) میں ہو جبکہ یہ عقد تَبَرُّع (Donation) ہے۔ لیکن یہ توجیہ درست نہیں۔ کیونکہ پالیسی ہولڈر کو حاصل ہونے والے فوائد کا انحصار پالیسی مالیت کی کمی پیشی پر ہوتا ہے یعنی پریمیئم کم تو فائدہ بھی کم پریمیئم زیادہ تو فائدہ بھی زیادہ ہوتا ہے اور یہ سب کچھ باقاعدہ ایک معاہدے کے تحت ہوتا ہے جس کی پابندی فریقین کے لیے لازمی ہوتی ہے اور اس کو قانونی تحفظ بھی حاصل ہے حتی کہ اگر کلیمز کی ادائیگی کے لیے رقم موجود نہ ہو تو (نام نہاد) وقف قرض لے کر یہ ادائیگی ممکن بناتا ہے ایسی صورت میں اس کو عقد تبرع قرار دینا ناقابل فہم ہے۔ نیز اس پر تبرع کی تعریف بھی صادق نہیں آتی کیونکہ تبرع کا معنی ہے کسی کو کوئی چیز اس طرح دی جائے کہ معاوضے کی خواہش نہ رکھی جائے جبکہ یہاں تو محرک ہی یہ ہے کہ مجھے اس کے عوض یہ فوائد حاصل ہوں گے۔

ایک تاویل کا جواب:

مروّجہ تکافل کے بعض حامی اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ پالیسی ہولڈر یہ فوائد دیئے گئے عطیات کی بنیاد پر نہیں بلکہ وقف کے قواعد وضوابط کے تحت حاصل کرتا ہے یعنی وہ یہ نہیں کہتا چونکہ میں نے وقف کو اتنا چندہ دیا ہے اس لیے میں ان فوائد کا حق رکھتا ہوں بلکہ وہ یہ کہتا

ہے کہ ان قواعد کی بنیاد پر مجھے یہ فوائد حاصل ہونے چاہییں۔ یہ قانونی حق اس کو عقد معاوضہ میں داخل نہیں کرتا۔

مگر دو وجوہ کے باعث یہ تاویل بیت عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہے:

۱۔ ایک تو اس لیے کہ پالیسی ہولڈر کو قواعد وضوابط کے تحت دعوی کرنے کا حق بھی تو دی گئی رقم کے بدلے ہی حاصل ہوا ہے اب آپ قواعد وضوابط کا نام لیں یا پریمیئم کی کمی بیشی کا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۲۔ دوسرا اس لیے کہ پالیسی ہولڈر کی نظر تو ان فوائد پر ہوتی ہے جو اس کو مستقبل میں اس کے بدلہ میں حاصل ہونا ہوتے ہیں وہ قواعد وضوابط کے تحت حاصل ہوں یا دی گئی رقم کے عوض اس کو اس سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے لوگوں کی اکثریت پالیسی حاصل کرتے وقت فوائد کے متعلق تو پوچھتی ہے مگر وقف کے قواعد وضوابط کے بارہ میں سوال نہیں کرتی۔ ایک مجلس میں جب راقم نے ایک مشہور تکافل کمپنی کے سنیئر کنسلٹنٹ سے پوچھا کیا آپ پالیسی حاصل کرنے کے خواہش مندوں کو قواعد وضوابط سے آگاہ کرتے ہیں تو انہوں صاف کہا کہ لوگ ہم سے صرف یہ پوچھتے ہیں کہ ہمیں کیا ملے گا قواعد وضوابط کے متعلق کبھی سوال نہیں ہوا۔

اس سے ثابت ہوا کہ جن خرابیوں کی بنا پر روائتی انشورنس حرام ہیں تکافل ان سے پاک نہیں۔

کیا نقدی کو وقف کیا جا سکتا ہے؟

یہاں یہ بحث بھی بڑی اہم ہے کہ روپیہ پیسہ وقف کیا جا سکتا ہے یا نہیں کیونکہ تکافل کمپنی کی پوری عمارت اس پر استوار ہے، لہذا ہم اس مسئلہ کو قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

اکثر فقہاء اور اہل علم کی رائے میں روپے پیسے اور درہم ودینار کا وقف ہی درست وجائز نہیں۔ چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ کی شرح فتح القدیر میں ہے:

((وَقَالَ الشَّافِعِيُّ رَحِمَهُ اللّٰهُ كُلُّ مَا أُمْكِنَ الِانْتِفَاعُ بِهِ مَعَ بَقَاءِ أَصْلِهِ وَيَجُوزُ بَيْعُهُ يَجُوزُ وَقْفُهُ ، وَهٰذَا قَوْلُ مَالِكٍ وَأَحْمَدَ أَيْضًا وَأَمَّا وَقْفُ مَا لَا يُنْتَفَعُ بِهِ إِلَّا بِالْإِتْلَافِ كَالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْمَأْكُولِ وَالْمَشْرُوبِ فَغَيْرُ جَائِزٍ فِي قَوْلِ عَامَّةِ الْفُقَهَاءِ ، وَالْمُرَادُ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ الدَّرَاهِمُ وَالدَّنَانِيرُ وَمَا لَيْسَ بِحُلِيٍّ))

''امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے: کہ ہر وہ چیز جس کو باقی رکھ کر اس سے فائدہ حاصل کرنا ممکن ہو اور اس کی بیع بھی جائز ہو تو اس کا وقف درست ہے یہ امام مالک اور امام احمد کا بھی قول ہے۔ باقی اس چیز کا وقف جس کو صرف کیے بغیر اس سے استفادہ ممکن نہ ہو جیسے سونا، چاندی اور کھانے پینے کی اشیاء ہیں تو عام فقہاء کے نقطہ نظر میں یہ جائز نہیں ہے۔ سونے اور چاندی سے مراد درہم، دینار اور وہ سونا ہے جو زیور کی شکل میں نہ ہو۔''

شارح بخاری علامہ ابن بطال رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((قال ابو حنيفة وابو يوسف لا يجوز وقف الحيوان والعروض والدنانير والدراهم)) [شرح صحيح البخاری : ج۸ ص۱۹۸]

''امام ابوحنیفہ اور ابو یوسف رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جانور، سامان اور درہم و دینار کا وقف جائز نہیں۔''

مشہور حنفی عالم علامہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

((واعلم أن وقف المنقول لا يصح على أصل المذهب واجازه محمد فيما تعارفه الناس)) [فيض الباری ج۳ ص:٤١٦]

''جان لو! اصل (حنفی) مذہب میں اشیاء منقولہ کا وقف صحیح نہیں ہے۔ مگر امام محمد رحمہ اللہ نے ان چیزوں میں اس کی اجازت دی ہے جن میں لوگوں کا عرف ہو جائے۔''

علامہ ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

((وَجُمْلَتُهُ أَنَّ مَا لَا يُمْكِنُ الِانْتِفَاعُ بِهِ مَعَ بَقَاءِ عَيْنِهِ ، كَالدَّنَانِيرِ وَالدَّرَاهِمِ ، وَالْمَطْعُومِ وَالْمَشْرُوبِ ، وَالشَّمْعِ ، وَأَشْبَاهِهِ ، لَا يَصِحُّ

وَقْفُهُ ، فِي قَوْلِ عَامَّةِ الْفُقَهَاءِ وَأَهْلِ الْعِلْمِ ، إِلَّا شَيْئًا يُحْكَى عَنْ مَالِكٍ ، وَالْأَوْزَاعِيِّ ، فِي وَقْفِ الطَّعَامِ ، أَنَّهُ يَجُوزُ وَلَمْ يَحْكِهِ أَصْحَابُ مَالِكٍ وَلَيْسَ بِصَحِيحٍ ؛ لِأَنَّ الْوَقْفَ تَحْبِيسُ الْأَصْلِ وَتَسْبِيلُ الثَّمَرَةِ ، وَمَا لَا يُنْتَفَعُ بِهِ إِلَّا بِالْإِتْلَافِ لَا يَصِحُّ فِيهِ ذَلِكَ))

[المغنی ج۸ص:۲۲۹]

''اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس چیز کو باقی رکھ کر اس فائدہ اٹھانا ممکن نہ ہو جیسے درھم و دینار ،کھانا ،مشروب ،شمع اور اس جیسی دوسری اشیاء عام فقہاء اور اہل علم کے نزدیک ان کا وقف درست نہیں ہے۔البتہ امام مالک اور امام اوزاعی ؒ سے کھانے کے وقف کے متعلق مروی ہے کہ یہ جائز ہے (اس کو امام مالک کے شاگردوں نے بیان نہیں کیا) لیکن یہ درست نہیں کیونکہ وقف کا مطلب ہے ''اصل کو باقی رکھنا اور اس کے فائدہ کو اللہ کی راہ میں خیرات کرنا'' اور جس کو تلف کیے بغیر اس سے فائدہ لینا ممکن نہ ہو اس میں وقف صحیح نہیں ہوتا۔''

مزید لکھتے ہیں:

((وَجُمْلَةُ ذَلِكَ أَنَّ الَّذِي يَجُوزُ وَقْفُهُ ، مَا جَازَ بَيْعُهُ ، وَجَازَ الِانْتِفَاعُ بِهِ مَعَ بَقَاءِ عَيْنِهِ ، وَكَانَ أَصْلًا يَبْقَى بَقَاءً مُتَّصِلًا ، كَالْعَقَارِ وَالْحَيَوَانَاتِ ، وَالسِّلَاحِ ، وَالْأَثَاثِ ، وَأَشْبَاهِ ذَلِكَ))

[المغنی ج ۸ص:۲۳۱]

''وقف اس کا جائز ہے جس کی بیع اور اس کو بعینہ باقی رکھ کر اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔اور وہ ایسی چیز ہو جو متصل باقی رہے جیسے زمین ،جانور ،اسلحہ ،اثاثہ اور اس قسم کی دوسری اشیاء ہیں''

علما و فقہا کا موقف تو آپ اوپر ملاحظہ کر چکے ہیں ،البتہ بعض اہل علم وہ بھی ہیں جو رقم کو بھی وقف کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ان میں امام بخاری ؒ بھی شامل ہیں۔چنانچہ انہوں نے اس کے حق میں عنوان بھی قائم کیا ہے۔

((بَابُ وَقْفِ الدَّوَابِّ وَالْكُرَاعِ وَالْعُرُوضِ وَالصَّامِتِ))

[صحيح البخارى ، كتاب الوصايا]

''جانوروں، گھوڑوں، سامان اور سونے، چاندی کے وقف کا بیان۔''

اپنے موقف پر استدلال کے لیے انہوں نے اس باب کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے:

((أَنَّ عُمَرَ حَمَلَ عَلَى فَرَسٍ لَهُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَعْطَاهَا رَسُولَ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم لِيَحْمِلَ عَلَيْهَا رَجُلًا ، فَأُخْبِرَ عُمَرُ أَنَّهُ قَدْ وَقَفَهَا يَبِيعُهَا ، فَسَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم أَنْ يَبْتَاعَهَا فَقَالَ لَا تَبْتَعْهَا ، وَلَا تَرْجِعَنَّ فِي صَدَقَتِكَ)) [ايضًا]

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا گھوڑا اللہ کی راہ میں دیا آپ نے وہ گھوڑا رسول اللہ کو دیا تاکہ کسی آدمی کو سواری کے لیے دے دیں۔ حضرت عمر کو اطلاع ملی کہ وہ شخص اس کو فروخت کر رہا ہے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ وہ اسے خرید لیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو مت خریدیں اور اپنا صدقہ واپس نہ لیں۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے موقف کی تائید میں امام زہری رحمہ اللہ کا یہ اثر بھی ذکر کیا ہے:

((قَالَ الزُّهْرِيُّ فِيمَنْ جَعَلَ أَلْفَ دِينَارٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ، وَدَفَعَهَا إِلَى غُلَامٍ لَهُ تَاجِرٍ يَتْجُرُ بِهَا ، وَجَعَلَ رِبْحَهُ صَدَقَةً لِلْمَسَاكِينِ وَالْأَقْرَبِينَ ، هَلْ لِلرَّجُلِ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ رِبْحِ ذَلِكَ الْأَلْفِ شَيْئًا ، وَإِنْ لَمْ يَكُنْ جَعَلَ رِبْحَهَا صَدَقَةً فِي الْمَسَاكِينِ قَالَ لَيْسَ لَهُ أَنْ يَأْكُلَ مِنْهَا)) [صحيح بخارى: كتاب الوصيا باب وقف الدواب والكراع والعروض والصامت]

''امام زہری نے اس شخص کے متعلق فرمایا جس نے ہزار دینار اللہ کی راہ میں دیے اور وہ اپنے تاجر غلام کو حوالے کر دیے کہ وہ ان سے تجارت کرے اور اس کا نفع مساکین اور رشتہ داروں کے لیے صدقہ کر دیا کیا وہ شخص اس ہزار کے نفع سے خود کھا سکتا ہے؟

خصوصاً اگر اس کا نفع مساکین کے لیے صدقہ نہ کیا ہو: امام زہری نے فرمایا اس کو (کسی صورت) یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس سے کھائے۔"

صحیح مؤقف:

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا تفقّہ فی الدین اور مقام ومرتبہ شک وشبہ سے بالاتر ہے لیکن اگر فریقین کے پیش کردہ دلائل کا باہم تقابل کیا جائے تو حسب ذیل وجوہ کے باعث ان حضرات کا مؤقف صائب معلوم ہوتا ہے جو روپے پیسے کے وقف کو جائز نہیں سمجھتے۔

- تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ وقف میں اصل چیز کو باقی رکھ کر صرف اس کی منفعت خرچ کی جائے گی۔ اس کی بنیاد نبی ﷺ کا یہ فرمان ہے:

((إِنْ شِئْتَ حَبَّسْتَ أَصْلَهَا، وَتَصَدَّقْتَ بِهَا)) [صحیح بخاری: کتاب الوصایا، باب الوقف کیف یکتب]

"اگر تو چاہے تو اس کا اصل روک لے اور اسکی منفعت (پیداوار) کو صدقہ کر دے۔"

یہ حدیث اس امر کی صریح دلیل ہے کہ وقف وہ چیز ہو سکتی ہے جس کو باقی رکھ کر فائدہ اٹھانا ممکن ہو جبکہ روپیہ اپنی اصل حیثیت میں رہتے ہوئے کوئی فائدہ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا، نہ اس کو کھایا جا سکتا ہے، نہ پہنا جا سکتا ہے، نہ اس میں رہائش رکھی جا سکتی ہے اور نہ ہی اس پر سواری کی جا سکتی ہے یہ تو حصول اشیاء کا ایک وسیلہ ہے یعنی جب تک اس کو خرچ نہ کریں اس سے استفادہ ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روپے، پیسے کو کرایہ پر دینا درست نہیں کیونکہ کرایہ اسی چیز کا لیا جا سکتا ہے جسے صرف کے بغیر استعمال کیا جا سکتا ہو جبکہ نقد میں یہ خوبی نہیں اس لیے اس کا کرایہ لینا جائز نہیں ہے۔ اسی بنا پر امام نووی اور علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہما نے درہم و دینار کے وقف کا جواز ان لوگوں کا مسلک بیان کیا ہے جو ان کا کرایہ لینا جائز سمجھتے ہیں ملاحظہ ہو: "روضة الطالبین ۲/ ۲۵٤ المغنی ۸/ ۲۲۹"

جب راجح مسلک کے مطابق ان کا کرایہ درست نہیں ہے مروجہ تکافل کے حامی بھی اس سے متفق ہیں اور وجہ بھی وہی بیان کرتے ہیں جو فقہائے کرام نے وقف کے عدم جواز

میں کی ہے کہ نقد کو استعمال کیے بغیر فائدہ اٹھانا ممکن نہیں۔ دیکھیے: ''اسلامی بینکاری کی بنیادیں'' ص:۱۶۹ از مولانا تقی عثمانی۔''

جب موجودہ تکافل کے مؤیدین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ روپیہ پیسہ ایسی چیز نہیں جس کو باقی رکھ کر مستفید ہوا جا سکے تو پھر فقہاء کرام کی اس شرط کہ ''وقف وہی چیز ہو سکتی ہے جو باقی رہ کر قابل فائدہ ہو'' کو نظر انداز کر کے نقد کے وقف کے جواز کا فتوی سمجھ سے بالاتر ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ:

جو حضرات نقد کے وقف کے قائل ہیں ان کے خیال میں روپے پیسے کو بھی باقی رکھ کر فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے وہ یوں کہ اس سے کاروبار کیا جائے جو نفع ہو وہ خرچ کر دیا جائے۔ مگر یہ دو وجہ سے درست نہیں ہے۔

- ایک تو اس لیے کہ یہ صورت روپے پیسے کو اسکی اصل حیثیت میں باقی رکھ کر فائدہ حاصل کرنے کی نہیں اس طرح کا فائدہ تو روپے پیسے کو کرایہ پر بھی لے کر لیا جا سکتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ شرعاً جائز نہیں کیوں؟ اس لیے کہ اس قسم کا فائدہ نقد کی تخلیق کا اصل مقصد نہیں ہے جیسا کہ علامہ ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ نے المغنی میں لکھا ہے
- دوسرا اس لیے کہ روپے پیسے کو کاروبار میں لگانے سے فائدہ کی بجائے نقصان کا بھی اندیشہ ہے اور ممکن ہے وقف ختم ہی ہو جائے اس لیے یہ کہنا کہ وقف کی ہوئی رقم سے کاروبار کر کے اس کا نفع خرچ کیا جائے گا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کہ ''اصل روک کر رکھو اور اس کی پیداوار خرچ کرو'' کے خلاف ہے۔

۲۔ جو حضرات نقد کے وقف کو ناجائز کہتے ہیں ان کا موقف درست ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قائلین نے اپنی تائید میں جو دلائل ذکر کیے ہیں وہ ثبوت کے لیے ناکافی ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے ایسی منقولی اشیاء کا وقف تو ثابت ہوتا ہے جن کا اپنا ذاتی استعمال ہو مثلاً گھوڑا اس کا اپنا ذاتی استعمال ہے وہ ہے سواری وغیرہ لیکن نقد جس کا اپنا کوئی ذاتی استعمال نہیں کا وقف ثابت نہیں ہوتا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے نقد کو گھوڑے پر

قیاس کیا ہے جو درست نہیں کیونکہ دونوں میں واضح فرق ہے۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بعض اہل علم کی رائے میں یہ وقف تھا ہی نہیں بلکہ صدقہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے تو فرمایا کہ اپنا صدقہ مت خریدو مگر بیچنے والے پر پابندی نہیں لگائی۔ اور نہ ہی حضرت عمر نے اس پر کوئی اعتراض کیا اگر یہ وقف ہوتا تو نبی ﷺ اس کو بھی منع فرما دیتے کیونکہ وقف کو فروخت کرنا جائز نہیں۔

۳۔ امام زہری رحمہ اللہ کا اثر بھی دلیل نہیں بن سکتا کیونکہ یہ وقف کے بارہ میں نہیں بلکہ عام صدقہ کے متعلق ہے اس کا قرینہ یہ ہے کہ ان سے پوچھا گیا کیا وہ شخص اس کے نفع سے خود بھی کھا سکتا ہے انہوں نے جواب دیا نہیں۔ اگر یہ وقف ہوتا تو یہ پابندی نہ لگاتے کیونکہ وقف کنندہ کو شرعاً اپنے وقف سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے۔

محدّث اسماعیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں زہری رحمہ اللہ کا اثر اس وقف کے خلاف ہے جس کی اجازت نبی ﷺ نے حضرت عمر کو دی تھی کہ ''اصل کو روکے رکھو اور ثمرہ خرچ کرو'' سونے چاندی سے تو تب ہی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جب اس کو بعینہٖ کسی دوسری چیز کی طرف نکالا جائے یہ اصل کو روکے رکھو اور ثمرہ خرچ کرو کی صورت نہیں بنتی۔ [فتح الباری ج ۵ ص: ۴۹۵]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے محدث اسماعیلی کے اعتراض کا جو جواب دیا ہے وہ صرف زیور جس کا ذاتی استعمال واضح ہے پر منطبق ہوتا ہے درھم و دینار پر نہیں اس لیے اس کو روپے پیسے کے وقف کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔

موجودہ تکافل کے حامی فتح القدیر کے حوالے سے امام زفر رحمہ اللہ کے شاگرد محمد بن عبداللہ انصاری رحمہ اللہ کے فتوی کا ذکر بھی بڑی شد و مد سے کرتے ہیں کہ انہوں نے درہم و دینار کے وقف کو جائز قرار دیا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ فتوی خود تکافل کمپنیوں کیخلاف جاتا ہے کیونکہ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

((قِيلَ وَكَيْفَ ؟ قَالَ يَدْفَعُ الدَّرَاهِمَ مُضَارَبَةً ثُمَّ يَتَصَدَّقُ بِهَا فِي الْوَجْهِ الَّذِيْ وَقَفَ عَلَيْهِ)) [فتح القدیر]

’’یہ کیسے ممکن ہے؟انہوں نے جواب دیا کہ وہ دراہم مضاربہ کی بنیاد پر کاروبار کے لیے دے پھران پر صدقہ کرے جن پر وقف کیا گیا ہے۔‘‘

جبکہ تکافل کمپنیوں کے مالکان اپنے قائم کیے ہوئے وقف سے کسی کو بطور مضاربہ رقم نہیں دیتے بلکہ خود ہی کاروبار کرتے ہیں اور اس کی باقاعدہ فیس وصول کرتے ہیں۔امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کے اثر میں بھی یہی ہے کہ اس نے غلام تاجر کو دیے تھے نہ کہ خود ہی تجارت میں لگا کر اس کے عوض فیس لینا شروع کر دی۔

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ جو حضرات نقد کے وقف کے قائل ہیں ان کا نقطہ نظر کمزور ہے۔لہٰذا تکافل کمپنیوں کی بنیاد ہی ایسے پر موقف استوار ہے جو دلائل کی قوت سے محروم ہے۔

فائدہ: یہاں یہ وضاحت کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ تکافل کے حامیوں کی رائے میں پالیسی ہولڈرز کی اقساط سے جو حصہ وقف پول میں جاتا ہے وہ وقف کی بجائے وقف کی ملکیت ہوتا ہے جو وقف کے مصالح کے علاوہ ان لوگوں پر خرچ ہوگا جن کے لیے وقف قائم کیا گیا ہوگا جیسا کہ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں سوڈان کے معروف عالم پروفیسر صدیق محمد امین ضریر کے نزدیک اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

((ومالم يأت الباحث بدليل على أن ما يتبرع للوقف يصرف للموقوف عليهم فأن تأصيل التأمين التكافلى على أساس الوقف ينهار من أساسه)) [تعقيب عن بحث تأصيل التأمين التكافلى على أساس الوقف والحاجة الداعية اليه]

’’جب تک محقق (مولانا تقی عثمانی) صاحب اس بات کی دلیل پیش نہیں کرتے کہ جو عطیہ وقف کو دیا جاتا ہے وہ ان لوگوں پر خرچ کیا جا سکتا ہے جن پر وقف کیا گیا ہو تو وقف کی بنیاد پر تکافلی انشورنس کا اصول اپنی بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے۔‘‘

فائدہ: یہاں اس امر کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ دنیا میں مروجہ تکافل کی سب سے

پہلی کمپنی سوڈان میں ۱۹۷۹ء میں صدیق محمد امین زیر نگرانی قائم ہوئی تھی لیکن اس کی بنیاد وقف کی بجائے تبرّع پر تھی۔ مگر اس کو وقف کی بنیاد پر قائم تکافل کمپنیوں کے مفتیان کرام جائز نہیں سمجھتے۔

بعض تحقیق طلب مسائل:

مروجہ اسلامی انشورنس میں ایلوکیشن اور ایڈمن فیس کے نام پر وصولی بھی غور طلب پہلو ہے جیسا کہ ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر آئے ہیں کہ پہلے سال قسط کی ستاسی (یہ زیادہ سے زیادہ ہے) دوسرے سال بیس جبکہ تیسرے سال دس فیصد رقم ایلوکیشن فیس کے نام پر کاٹ لی جاتی ہے یہ ساری رقم کنسلٹنٹ جو کسٹمر گھیر کر لاتا ہے اور برانچ ذمہ داران کی جیبوں میں جاتی ہے۔ پالیسی ہولڈر کو اس کا علم نہیں ہوتا۔ یہ بالکل وہی طریقہ ہے جو روائتی انشورنس کا ہے کہ پہلی قسط کا معتد بہ حصہ انشورنس کمپنی کے ایجنٹ کو دے دیا جاتا ہے۔ جب نام نہاد اسلامی انشورنس نظریاتی مرحلہ میں تھی تب یہ کہا جاتا تھا کہ روائتی انشورنس میں یہ ظلم ہوتا ہے کہ پہلی قسط تقریباً پوری کی پوری ایجنٹ کی جیب میں چلی جاتی ہے جبکہ تکافل میں یہ نہیں ہوتا۔ لیکن جب عملی مرحلہ آیا تو نام نہاد اسلامی انشورنس نے بھی وہی راستہ اختیار کیا۔ ہمارے خیال میں یہ پالیسی ہولڈر کے ساتھ زیادتی ہے وہ اس طرح کہ اگر وہ ایک قسط ادا کرنے کے بعد تکافل کمپنی کو الوداع کہتا ہے تو قواعد وضوابط کے مطابق اس کو صرف وہ رقم ملتی ہے جو انوسٹمنٹ کھاتے میں جمع ہو یا پھر اس سے حاصل ہونے والا نفع۔ اب ستاسی فیصد تو ایلوکیشن فیس کے نام پر پہلے ہی الگ کیا جا چکا ہے باقی تیرہ فیصد بچا اس میں سے آدھا وقف میں چلا گیا جو شرعاً واپس نہیں لیا جا سکتا۔ جو باقی رہ گیا اس میں سے ڈیڑھ فیصد مینجمنٹ اور ۶۵ سے لیکر ایک سو دس روپے تک ماہانہ ایڈمن فیس بھی لی جاتی ہے۔ پالیسی ہولڈر کے ہاتھ کیا آیا؟ تکافل کمپنی کے تنخواہ دار شریعہ بورڈ کے مفتیان کرام کا ایک عدد فتوی اور اس کے نتیجے میں اسلام کے نظام تکافل کے متعلق پیدا ہونے والی بدگمانی کہ یہ بھی استحصال پر مبنی نظام ہے۔ (اعاذنا اللّٰہ منہ) ایلوکیشن فیس کی اس کے علاوہ کوئی توجیہ نہیں کی

جاسکتی کہ یہ باطل حربوں سے مال کھانے کی بدترین شکل ہے۔

ایک غیر معقول استدلال:

مروجہ تکافل کے حامی بڑی سادگی سے کہتے ہیں کہ ہم ہر بات پہلے بتادیتے ہیں۔ناجائز تو تب ہو جب کوئی بات خفیہ رکھی جائے۔یہ انتہائی لغو قسم کا استدلال ہے۔کیا بتا کر باطل طریقے سے کسی کا مال ہڑپ کرنا جائز ہو جاتا ہے؟ ناجائز کاروبار میں ملوث لوگوں کی اکثریت بھی یہی کہتی ہے کہ ہم ہر بات پہلے طے کرتے ہیں، پھر یہ ناجائز کیسے؟ کیا تکافل کے حامی اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ اسلام نے بعض معاملات محض اس لیے ناجائز قرار دیے ہیں کہ ان سے کسی ایک فریق کو نقصان پہنچ رہا ہوتا ہے۔

خلاصہ

مذکورہ بالا تفصیل کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

- مروجہ تکافل شرعی تکافل سے بالکل مختلف ہے۔
- روائتی انشورنس کی طرح رائج الوقت تکافل بھی سود اور غرر پر مشتمل ہے۔
- تکافل پالیسی عقد معاوضہ ہے نہ کہ عقد تبرُّع جیسا کہ تکافل کے حامی باور کراتے ہیں۔
- راجح نقطہ نظر کے مطابق نقدی کو وقف نہیں کیا جا سکتا۔لہٰذا تکافل کمپنیوں کی بنیاد ہی غلط ہے۔
- ایلوکیشن فیس باطل طریقہ سے مال ہڑپ کرنے میں داخل ہے۔

❁❁❁

ششم

قرض کے مسائل

قرض لینا پسندیدہ نہیں:

قرض چونکہ ''رات کی پریشانی اور دن کی ذلت ہے'' اس لیے شریعت اسلامیہ عام حالات میں قرض لینے کو پسند نہیں کرتی۔ نبی ﷺ خود بھی قرض سے پناہ مانگتے اور اپنے ساتھیوں کو بھی اس سے بچنے کی تلقین فرماتے۔ ذیل میں اس سلسلے کی بعض روایات ملاحظہ فرمائیں:

((أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ كَانَ يَدْعُو فِي الصَّلَاةِ وَيَقُولُ اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ فَقَالَ لَهُ قَائِلٌ مَا أَكْثَرَ مَا تَسْتَعِيذُ يَا رَسُولَ اللَّهِ مِنَ الْمَغْرَمِ قَالَ إِنَّ الرَّجُلَ إِذَا غَرِمَ حَدَّثَ فَكَذَبَ وَوَعَدَ فَأَخْلَفَ)) [صحيح البخاری ، باب من استعاذ من الدين]

''بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نماز میں یہ دعا کیا کرتے تھے اے اللہ میں گناہ اور قرض سے آپ کی پناہ طلب کرتا ہوں۔ ایک کہنے والے نے آپ سے عرض کیا اے اللہ کے رسول آپ قرض سے کس قدر زیادہ پناہ مانگتے ہیں۔ آپ نے فرمایا بلاشبہ انسان جب مقروض ہوتا ہے بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور وعدہ کرتا ہے تو خلاف ورزی کرتا ہے۔''

((لَا تُخِيفُوا أَنْفُسَكُمْ أَوْ قَالَ الْأَنْفُسَ فَقِيلَ لَهُ يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا نُخِيفُ أَنْفُسَنَا قَالَ الدَّيْنَ)) [مسند احمد ، حديث عقبة بن عامر الجهنی]

''اپنی جانوں کو خوف میں مبتلا نہ کرو آپ سے کہا گیا اے اللہ کے رسول ہم کیسے اپنی جانوں کو خوف میں مبتلا کرتے ہیں فرمایا قرض کے ساتھ۔''

پہلی حدیث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قرض مقروض کو جھوٹ اور وعدہ کی خلاف ورزی تک

پہنچا دیتا ہے جبکہ دوسری حدیث یہ بتا رہی ہے کہ قرض لینے والے انسان کا امن وسکون ختم ہو جاتا ہے۔

معقول عذر کی بنا پر قرض لینے کی اجازت ہے:

تاہم ناگزیر حالات میں قرض لینے کی گنجائش رکھی گئی ہے بشرطیکہ مستقبل میں ادائیگی کا امکان اور پختہ ارادہ ہو۔ذخیرہ حدیث میں اس کی کافی مثالیں موجود ہیں۔ یہاں صرف ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔عبداللہ بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

((اسْتَقْرَضَ مِنِّي النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم أَرْبَعِينَ أَلْفًا فَجَاءَهُ مَالٌ فَدَفَعَهُ إِلَيَّ وَقَالَ بَارَكَ اللَّهُ لَكَ فِي أَهْلِكَ وَمَالِكَ إِنَّمَا جَزَاءُ السَّلَفِ الْحَمْدُ وَالْأَدَاءُ))[سنن النسائی ، باب الاستقراض]

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے چالیس ہزار قرض لیے آپ کے پاس مال آیا تو آپ نے مجھے لوٹا دیے اور فرمایا اللہ تیرے اہل اور مال میں برکت پیدا فرمائے قرض کا بدلہ تو شکریہ ادا کرنا اور (قرض کی) ادائیگی ہے۔''

ذاتی ضرورت کے علاوہ اجتماعی اور ملکی ضرورت کے لیے بھی قرضہ لیا جا سکتا ہے۔

قرض معاف نہیں ہوگا:

شریعت کی نگاہ میں قرض کی عدم ادائیگی ناقابل معافی گناہ ہے۔چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((يُغْفَرُ لِلشَّهِيدِ كُلُّ ذَنْبٍ إِلَّا الدَّيْنَ)) [صحیح مسلم، باب من قتل فی سبیل اللہ]

''شہید کا قرض کے علاوہ ہر گناہ معاف کر دیا جاتا ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحب استطاعت مقروض کی طرف سے قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کو بھی ظلم قرار دیا ہے۔ ہاں اگر مقروض تنگدست ہو تو قرآنی حکم کے مطابق اس کو

فراخ دستی تک مہلت ملنی چاہیے۔

قرض کے بدلے فائدہ اٹھانا:

قرض کی وجہ سے حاصل ہونے والا ہر فائدہ سود ہے۔ ہم پیچھے حضرت ابی بن کعب، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کے حوالے سے بیان کر آئے ہیں کہ:

((انهم نهوا عن قرض جرّ منفعة)) [ارواء الغليل :٥/٢٣٤]

''انہوں نے اس قرض سے منع کیا جو فائدے کا باعث بن رہا ہو۔''

بلکہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ تو مقروض کی طرف سے دیے گئے ہدیہ کو بھی سود قرار دیتے تھے۔ چنانچہ ان کا یہ فتویٰ صحیح بخاری میں بایں الفاظ نقل ہوا ہے:

((اذا كان لك على رجل حق فاهدى اليك حمل تبن او حمل شعير او حمل قت فلا تاخذه فانه ربا)) [صحيح بخارى، كتاب المناقب، باب مناقب عبدالله بن سلام]

''جب تمہارا کسی شخص پر کوئی حق ہو اور پھر وہ تمہیں ایک تنکے، جو کے ایک دانے یا ایک گھاس کے برابر بھی ہدیہ دے تو اسے قبول نہ کرنا، کیونکہ وہ بھی سود ہے۔''

ہاں اگر قرض خواہ اور مقروض کے درمیان پہلے سے ہدیہ کا تبادلہ چلا آ رہا ہو تو پھر اس کی اجازت ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو قرض دینے کے ساتھ کوئی چیز خریدنے یا بیچنے کی شرط لگانے کی بھی اجازت نہیں دی۔

((لَا يَحِلُّ سَلَفٌ وَبَيْعٌ)) [سنن الترمذى، باب ما جاء فى كراهية بيع ماليس عنده]

''قرض اور بیع جائز نہیں۔''

یعنی قرض خواہ کا یہ شرط لگانا کہ میں تب قرض دوں گا جب آپ یہ چیز مجھ سے خریدیں

گے یا اپنی فلاں چیز مجھے بیچیں گے، درست نہیں۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اگر مقروض ادائیگی کے وقت بغیر شرط کے از خود زیادہ واپس کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ ''حسن القضاء'' یعنی عمدہ طریقے سے ادائیگی کرنے میں شامل ہے اور یہ آپ کی سنت ہے۔ مگر اس کو بطور نظام کے اختیار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ طے شدہ اضافہ ہی شمار ہوگا۔

قرض کی ادائیگی کا معیار:

افراط زر کی وجہ سے کرنسی کی قوت خرید کم ہوتی رہتی ہے اس لیے قرض کی بحث میں یہ سوال انتہائی اہم ہے کہ قرض کی واپسی کس طرح ہوگی نوٹ کے اوپر لکھی ہوئی قیمت کے مطابق یا قوت خرید کے لحاظ سے؟

- بعض حضرات کے خیال میں قرض کی ادائیگی سونے سے وابستہ ہونی چاہیے یعنی قرض دیتے وقت یہ سمجھنا چاہیے کہ نوٹوں کی بجائے سونا قرض دیا جا رہا ہے اور قرض دی گئی رقم کے بدلے جتنا سونا اس دن خریدا جا سکتا تھا جس دن قرض دیا گیا تھا واپسی کے وقت اتنا سونا یا اس کی قیمت ادا کی جانی چاہیے۔ لیکن یہ رائے صائب نہیں کیونکہ اس کی بنیاد اس نظریے پر ہے کہ نوٹ کی پشت پر سونا ہے حالانکہ یہ بات طے شدہ ہے اب نوٹ سونے کی نمائندگی نہیں کرتے۔
- بعض اہل علم کی رائے میں قرض کی واپسی قیمتوں کے اشاریئے سے مربوط ہونی چاہیے اس کا مطلب ہے کہ قرض کی واپسی کے وقت نوٹوں کی اتنی مقدار زیادہ ادا کی جانی چاہیے جو افراط زر کی شرح کے مساوی ہو۔ مثلاً ایک ہزار روپے قرض دیے گئے ادائیگی کی تاریخ تک افراط زر میں بیس فیصد اضافہ ہو گیا تو اب ایک ہزار کی بجائے بارہ سو روپے واپس کیے جائے۔ لیکن یہ نقطہ نظر بھی کمزور ہے ایک تو اس لیے کہ قیمتوں کا اشاریہ تخمینی ہے جبکہ قرض کی ادائیگی میں حقیقی برابری ضروری ہے۔

دوسرا اس لیے کہ شرعی طور پر قرض کی ادائیگی میں قوت خرید کی بجائے مقدار میں برابری کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

- اس حوالے سے تیسری تجویز یہ پیش کی جاتی ہے کہ قرض کا لین دین روپے کی بجائے ڈالر میں کیا جائے یعنی اگر کسی شخص کو ایک ہزار روپے کی ضرورت ہو تو قرض دینے والا ہزار روپے کی جگہ اتنی مالیت کے ڈالر خرید کر دے اور مقروض بھی ڈالر ہی واپس کرے۔ مگر بوجوہ یہ تجویز بھی قابل عمل نہیں۔
- افراط زر کا اثر ڈالر پر بھی پڑتا ہے روپے کی نسبت کم سہی مگر پڑتا ضرور ہے۔
- شہری علاقوں سے دور دیہات اور قصبات میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جن کے لیے منی چینجر تک پہنچنا بھی ایک مسئلہ ہے اس تجویز کے مطابق قرض کا لین دین مشکلات کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔
- اس تجویز کے مطابق قرض خواہ اور مقروض کو دو دو مرتبہ منی چینجر کے پاس جانا پڑے گا ایک مرتبہ ڈالر لینے اور دوسری مرتبہ ڈالر کے بدلے روپے حاصل کرنے کے لیے۔ ظاہر ہے ہر مرتبہ کمیشن بھی دینا پڑے گا جس سے قرض کا لین دین مزید بوجھ بن جائے گا۔

اس لیے صحیح موقف یہی ہے کہ قرض میں سو کے بدلے سو کا نوٹ ہی واپس کرنا ضروری ہے خواہ اس کی قوت خرید کم ہو چکی ہو۔

ایک اعتراض کا جواب:

بعض حضرات کہتے ہیں یہ تو قرض خواہ پر ظلم ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرض دینا مقروض کے ساتھ ہمدردی ہے اسی لیے ہماری شریعت نے دو مرتبہ قرض دینے کو ایک مرتبہ صدقہ کرنے کے برابر قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُقْرِضُ مُسْلِمًا قَرْضًا مَرَّتَيْنِ إِلَّا كَانَ كَصَدَقَتِهَا مَرَّةً))

[سنن ابن ماجه ، باب القرض]

’’جو مسلمان کسی مسلمان کو دو مرتبہ قرض دے وہ ایک دفعہ صدقہ کے برابر ہوگا۔‘‘

یعنی ایک مرتبہ قرض دینا نصف صدقہ کے مساوی ہے۔

اگر کوئی اس اجر و ثواب پر مطمئن نہیں ہے تو اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ قرض نہ دے اسلام اس کو مجبور نہیں کرتا۔ اگر حصول نفع کا ارادہ ہو تو اس کے لیے قرض کی بجائے شرکت و مضاربت کو اختیار کیا جانا چاہیے۔

مزید برآں افراطِ زر اجتماعی مسئلہ ہے جس میں مقروض کا کوئی عمل دخل نہیں ہے اس کی تلافی کا ذمہ دار مقروض کو ٹھہرانا زیادتی ہے۔

خلاصہ

- سوائے انتہائی مجبوری کے قرض لینے سے بچنا چاہیے۔
- قرض ہر حال میں واپس کرنا چاہیے۔
- قرض کے عوض فائدہ اُٹھانا جائز نہیں۔
- قرض میں سو (۱۰۰) کے بدلے سو (۱۰۰) کا نوٹ ہی واپس کیا جائے گا۔
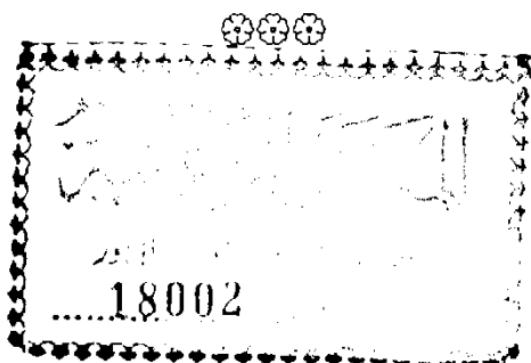
احباب دانش جانتے ہیں کہ اب تک ملک بھر میں ابو ہریرہ شریعہ کالج واحد ادارہ ہے۔ جس میں لازمی (Comulsary) نصاب کے طور پر بیک وقت درس نظامی اور گریجویشن کروائی جاتی ہے۔ لہٰذا اپنے بچوں کو ابو ہریرہ کالج میں داخل کروائیں تاکہ وہ دینی و دنیوی علوم سے آراستہ ہو سکیں۔ بفضل اللہ تعالیٰ یہ ادارہ صرف مقامی احباب کی مدد سے چل رہا ہے۔

داخلہ میٹرک کے رزلٹ سے پہلے اور امتحان کے فوراً بعد

میٹرک کا امتحان دینے والے طلباء داخلہ لے سکتے ہیں۔ تاہم فیل ہونے کی صورت میں طالب علم کو فارغ کر دیا جائے گا۔

نصاب

سال اول: ترجمۃ القرآن سورۃ الفاتحہ تا الاعراف، مشکوٰۃ اول، علم النحو، کتاب النحو، علم الصرف، ابواب الصرف، دروس اللغۃ العربیۃ (دو حصے)، فرسٹ ائیر بمطابق انٹرمیڈیٹ بورڈ لاہور۔

سال دوم: ترجمۃ القرآن سورۃ الاعراف تا النمل، مشکوٰۃ ثانی، نحو میر، شرح مائۃ عامل، کتاب الصرف، اطیب، المنح، معلم الانشاء (دو حصے) سیکنڈ ائیر بمطابق انٹرمیڈیٹ بورڈ لاہور۔

سال سوم: ترجمۃ القرآن، مسلم شریف، ترمذی شریف، ہدایۃ النحو، علم الصیغہ، السراجی، شرح نخبۃ الفکر، تھرڈ ائیر۔

سال چہارم: بخاری شریف، ہدایہ الوجیز، شرح ابن عقیل، الفوز الکبیر، فورتھ ائیر نصاب، بمطابق پنجاب یونیورسٹی۔

ابو ہریرہ اکیڈمی کی نشریات، از قلم: میاں محمد جمیل

فہم القرآن: ابن کثیر، رازی، دیگر عربی تفاسیر کا خلاصہ اور تفسیر ثنائی، معاف تدبر، تفہیم القرآن کے اہم نکات پر مشتمل، جدید و قدیم علوم کا سنگھم جس میں رواں ترجمہ اور تفسیر بالحدیث کا التزام۔

امتیاز تفسیر: لفظی ترجمہ، آیت کے مسائل کی الگ الگ نشاندہی، ہر آیت کے مرکزی مضمون کی تفسیر بالقرآن کے ذریعے ایک مکمل تقریر۔ پہلے پندرہ پارے تین جلدوں میں دستیاب ہے۔ تفسیر کا آغاز 2005ء میں کیا گیا اور ہر سال پانچ پاروں پر مشتمل جلد پیش کی جا رہی ہے۔ ان شاء اللہ 2011ء میں مکمل ہو جائے گی۔

فہم الحدیث: مشکوٰۃ المصابیح سے متفق علیہ اور بخاری و مسلم کی مکمل روایات۔ اس کے مطالعہ سے تعلیم یافتہ طبقہ کو 80 فیصد مسائل کسی عالم سے پوچھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

دیگر تصانیف: سیرت ابراہیم علیہ السلام ☆ انبیاء علیہم السلام کا طریقہ دعا ☆ دین تو آسان ہے ☆ زکوٰۃ کے مسائل و فوائد ☆ آپ ﷺ کا تہذیب و تمدن ☆ مشکلات کیوں؟ نکلنے کے الہامی راستے ☆ آپ ﷺ کا حج (مختصر مگر جامع، ہر رکن کا فلسفہ) ☆ فضیلت قربانی اور اس کے مسائل ☆ آپ ﷺ کی نماز (قیام و سجود کی عملی تصویر) ☆ برکات رمضان ☆ اتحاد امت و نظم جماعت ☆ جادو کی تباہ کاریاں...... ان کا شرعی علاج۔

ملنے کا پتہ: نعمانی کتب خانہ ☆ مکتبہ سلفیہ ☆ مکتبہ قدوسیہ ☆ مکتبہ دارالسلام اردو بازار لاہور۔

میاں محمد جمیل، پرنسپل ابو ہریرہ شریعہ کالج، 37۔ کریم بلاک اقبال ٹاؤن لاہور۔ 042-5417233